۷۸۶

جلد (۳) عدد (۱) — رجب سنہ ۱۳۵۲ھ

ترجمان القرآن

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

مرتبہٗ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صمہ — بیرون ہند کے لئے ۵ مہ — قیمت فی پرچہ ۸ر

چند نایاب کتابیں اور انکی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

تفسیر القرآن مکمل آٹھ جلدوں میں آج تک اس سے بہتر تفسیر شائع نہیں ہوئی سینکڑوں محبان ملت و مقتدر علماء سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ تفسیر نہایت معتبر اور مستند ہے اور اس کی روایات صحیح اور سلف صالحین کے عقیدے کے موافق ہیں۔ یہ تفسیر اسلام کے عقاید۔ عبادات، و معاملات کے مسائل اور علم تصوف کا بحر ذخار ہے۔ عاشقان کلام الٰہی کے لئے نایاب تحفہ ہے اصلی قیمت۔ (۲۱) رعایتی (۱۵)

تاریخ اسلام مصنفہ رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ اس حیثیت کی کوئی کتاب آجتک نہیں چھپی گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ اصلی قیمت (ے) رعایتی (عہ)

مقدمہ تاریخ ابن خلدون کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں جسے بصرف زر کثیر کارخانہ وطن نے تیار کرایا ہے آجتک کسی شخص کو عبارت کی دقت کی وجہ سے اردو میں ترجمہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی کل اہم اسلامی علوم و فنون و واقعات شہادت امام حسین پر مدلل بحث کی گئی ہے اصلی قیمت کل عہ

رعایتی ہ

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب کا اردو ترجمہ خلفائے راشدین کی مستند ترین تاریخ اصل قیمت (ے) رعایتی قیمت (صہ)

سیرۃ الرسول حصہ اول و دوم اس میں نسب نامہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و قبائل قریش کا نسب قبائل و قوم عرب کی مستند تاریخ۔ قیمت ہر دو حصہ اصلی عہ رعایتی عہ

انجیل برنباس اس مقدس انجیل کا ترجمہ ہے جس کو حاملان دین عیسوی نے عہد تاریک میں بالکل نابود کر دیا تھا کیونکہ اس میں حضرت رسول مقبول کے ظہور کی صریح خبر موجود ہے۔ (اصلی قیمت عہ رعایتی قیمت عہ

ترجمہ تفسیر کبیر فاتح العلوم جلد اول تفسیر سورۃ الحمد مولفہ امام فخر الدین رازی۔ اسے ابتک اردو کا جامہ پہنانے کی کسی صاحب کو ہمت نہ پڑتی تھی کارخانہ وطن نے اس بھاری کمی کو پورا کر دیا اصلی قیمت (ے) رعایتی عہ

کلید خزاین قرآنی اس کی مدد سے کسی آیت کا ایک لفظ یا کلمہ یاد ہو۔ تو بلا تامل پوری آیت کا ترجمہ معہ نشان سورت و تعداد آیت ملجاتا ہے۔ مزید براں اس کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں لفظ کتنی مرتبہ اور کس کس سورت میں آیا ہے۔ اصلی قیمت چھ روپیہ رعایتی صہ

فہرست مضامین

اشارات

ہماری روزمرہ کی بول چال میں بعض ایسے الفاظ اور فقرے رائج ہیں جن کو بولتا تو ہر شخص ہے مگر سمجھتے بہت کم ہیں۔ کثرت استعمال نے ان کا ایک اجمالی مفہوم لوگوں کے ذہن نشین کر دیا ہے، بولنے والا جب ان الفاظ کو زبان سے نکالتا ہے تو وہی مفہوم مراد لیتا ہے اور سننے والا جب انہیں سنتا ہے تو اسی مفہوم کو سمجھتا ہے لیکن وہ گہرے معانی جن کے لئے واضع نے ان الفاظ کو وضع کیا تھا، جہلا تو درکنار، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی معلوم نہیں ہوتے۔

مثال کے طور پر لفظ "اسلام" اور "مسلمان" کو لیجئے کس قدر کثرت سے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اور کتنی ہمہ گیری کے ساتھ انہوں نے ہماری زبانوں پر قبضہ کر لیا ہے؟ مگر کتنے بولنے والے ہیں۔ جو ان کو سوچ سمجھ کر بولتے ہیں؟ اور کتنے سننے والے ہیں جو انہیں سنکر وہی مفہوم سمجھتے ہیں جس کے لئے یہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں؟ غیر مسلموں کو جانے دیجئے۔ خود مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "مسلمان" کہتے اور اپنے مذہب کو "اسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ "مسلمان" ہونے کے معنی کیا ہیں اور لفظ "اسلام" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

آئیے آج تھوڑا سا وقت ہم انہیں الفاظ کی تشریح میں صرف کریں۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے اگر آپ لوگوں کے احوال پر نگاہ ڈالیں تو عموماً تین قسم کے لوگ آپ کو ملیں گے۔ ایک قسم ان لوگوں کی جو علانیہ آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل ہیں۔ ہر معاملہ میں اپنی

رائے پر اعتماد کرتے ہیں صرف اپنی عقل کے فیصلوں کو صحیح سمجھتے ہیں، اور وہی طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ان کے اپنے خیال میں صحیح ہوتا ہے کسی مذہب کی پیروی سے ان کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جو بظاہر کسی مذہب کو مانتے ہیں، مگر حقیقت میں پیروی اپنے ہی خیالات کی کرتے ہیں وہ اپنے عقائد اور قوانین عمل کے لئے مذہب کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ خود اپنی طبیعت کے رجحان یا دلچسپی یا اغراض و حاجات کے لحاظ سے کچھ عقائد اپنے ذہن میں جما لیتے ہیں، عمل کے کچھ طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں، اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو ان کے مطابق ڈھال لیں گویا درحقیقت وہ مذہب کے پیرو نہیں ہیں بلکہ مذہب ان کا پیرو ہے۔

تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو خود اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ اپنی عقل کو معطل رکھتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے دوسروں کی تقلید کرنے لگتے ہیں خواہ وہ ان کے باپ دادا ہوں یا ان کے ہم عصر۔

پہلا گروہ آزادی کے نام پر مرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کے صحیح حدود کیا ہیں؟ فکر و عمل کی آزادی بلاشبہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو گمراہی بن جاتی ہے۔ جو شخص ہر معاملہ میں صرف اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے، ہر مسئلے میں صرف اپنی عقل کو حکم بناتا ہے، وہ دراصل اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے علم اور اس کی عقل نے دین اور دنیا کے تمام امور کا احاطہ کر لیا ہے۔ کوئی حقیقت اور مصلحت اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر منزل کی رسم و راہ سے وہ باخبر ہے۔ ہر مسلک کی پیچیدگیوں کا اسے علم ہے۔ ہر رستے کی انتہا کو بھی وہ اسی طرح جانتا ہے جس طرح اس کی ابتدا کو۔ یہ علم اور ہوشمندی کا زعم درحقیقت ایک زعم باطل ہے اور اگر انسان صحیح معنوں میں خود اپنی عقل کو حکم بنائے تو خود عقل ہی یہ کہہ دے گی کہ میرا اندھا معتقد مجھ کو جن صفات سے متصف سمجھتا ہے، ان سے میں حقیقۃً متصف نہیں ہوں مجھ کو اپنا واحد رہنما سمجھنے والا صرف میری رہنمائی میں زندگی کی راہ طے کرنے والا ٹھوکروں، لغزشوں، گمراہیوں اور ہلاکتوں سے کبھی محفوظ

نہیں رہ سکتا۔

اس قسم کی حریت فکر و عمل، تمدن و تہذیب کے لئے بھی مہلک ہے۔ حریت کا اقتضا یہ ہے کہ ہر شخص وہی عقائد رکھے جو خود اس کے اپنے خیال میں صحیح ہو اور اسی راہ پر چلے جو اس کی اپنی عقل کے مطابق درست ہو۔ تمدن و تہذیب کا اقتضا یہ ہے کہ ایک نظام تمدن میں جتنے لوگ ہوں وہ سب چند بنیادی عقائد و افکار پر متفق ہوں، اور اپنی عملی زندگی میں ان مخصوص اطوار و آداب اور قوانین کی پیروی کریں جو حیات اجتماعی کی تنظیم کے لئے مقرر کر دیے گئے ہیں پس حریت فکر و عمل اور تمدن و تہذیب میں کھلی ہوئی منافات ہے۔ حریت، افراد میں خود سری، بے قیدی، انارکی پیدا کرتی ہے۔ تمدن ان سے اتباع، پیروی اور تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے جہاں کامل حریت ہوگی۔ وہاں تمدن نہ ہوگا۔ اور جہاں تمدن ہوگا وہاں افراد کو ایک بڑی حد تک حریت فکر و عمل سے دست کش ہونا پڑے گا۔

دوسرے گروہ کا حال پہلے گروہ سے زیادہ بُرا ہے۔ پہلا گروہ صرف گمراہ ہے۔ دوسرا گروہ اس کے ساتھ جھوٹا، منافق، دھوکہ باز اور بد طینت بھی ہے۔ اگر تاویل کے جائز حدود میں رہ کر ایک شخص اپنے مذہب اور اپنے تخیلات و رجحانات میں موافقت پیدا کر سکتا ہو تو حریت فکر و عمل کے ساتھ مذہب کا اتباع ممکن ہے۔ اگر انسان کے اپنے رجحانات مذہب کے خلاف ہوں اور اس کے باوجود وہ مذہب کو صحیح اور اپنے رجحانات کو غلط سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا کہ وہ واقعی اس مذہب کو مانتا ہے جس کی پیروی کا وہ دعویٰ کرتا ہے لیکن اگر مذہب کی واضح تعلیمات سے اس کے عقائد اور اعمال صریحاً مختلف ہوں، اور وہ اپنے انہی عقائد و اعمال کو صحیح بھی سمجھتا ہو، اور پھر اپنے آپ کو مذہب کے دائرے میں شامل رکھنے کے لئے مذہبی تعلیمات کو اپنے خیالات اور طور طریقوں کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہو تو ایسے شخص کو ہم کودن نہیں کہیں گے

کیوں کہ کوئی دن سے اتنی ہوشیاری کا کام کہاں بن آتا ہے؟ ہیں مجبوراً اُس کو بے ایمان کہنا پڑیگا۔ ہم یہ سمجھنے پر مجبور رہوں گے کہ اس میں مذہب سے علانیہ انحراف کرنے کے لئے کافی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ اس لئے وہ منافقت کی راہ سے مذہب کا پیرو بنتا ہے۔ ورنہ کونسی چیز اس کیلئے ایک ایسے مذہب کو چھوڑ دینے میں مانع ہے جس کی تعلیمات اس کی عقل کے فیصلوں کے خلاف ہیں، اس کے حقیقی افکار و عقائد کی ضد واقع ہوئی ہیں اور اسے ان طریقوں پر چلنے سے روکتی ہیں جن پر وہ سچے دل سے چلنا چاہتا ہے۔ اور واقع میں چل بھی رہا ہے؟

تیسرا گروہ اپنے مرتبہ عقلی کے لحاظ سے سب سے زیادہ فرد تر ہے۔ پہلے دونوں گروہوں کی غلطی تو یہ ہے کہ وہ عقل سے اتنا کام لیتے ہیں جتنا وہ نہیں کر سکتی۔ اور اس گروہ کی غلطی یہ ہے کہ یہ سرے سے عقل سے کام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو اتنا کم کہ نہ لینے کے برابر۔ ایک صاحب عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو، اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی اعتقاد رکھتے تھے، یا فلاں قوم جو بڑی ترقی یافتہ ہے، وہ بھی اسی عقیدہ کی معتقد ہے؟ اسی طرح جو شخص اپنے دینی یا دنیوی معاملات میں بعض طریقوں کی صرف اس لئے پیروی کرتا ہو کہ باپ دادا سے وہی طریقے چلے آرہے ہیں، یا بعض طریقوں کو صرف اس بنا پر اختیار کرتا ہو کہ اس کے عہد کی غالب قوموں میں وہی طریقے رائج ہیں، وہ دراصل اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ خود اس کے جیجے میں دماغ اور دماغ میں سوچنے کی قابلیت نہیں ہے۔ اس کے پاس خود کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہو۔ اتفاقاً وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہو گیا۔ اس لئے ہندو مذہب کو صحیح سمجھتا ہے۔ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوتا تو اسلام کو برحق مانتا۔ اگر عیسائی کی اولاد ہوتا تو عیسائیت پر جان دیتا۔ اسی طرح یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں فرنگی قومیں برسراقتدار ہیں اس لئے وہ فرنگی طور طریقوں کو معیار تہذیب سمجھتا ہے۔ اگر چینی برسراقتدار ہوتے تو یقیناً اس کے نزدیک چینی طور طریقے معیار تہذیب ہوتے، اور اگر آج دنیا پر افریقہ کے حبشیوں کا تسلط ہو جائے تو کوئی شک نہیں کہ یہ خفیف العقل

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى (۵۳: ۲۴)	پیروی نہیں کرتے حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے کیا انسان کے لئے وہی حق ہے جس کی وہ تمنا کرے؟
اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵: ۲۳)	کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا خدا بنالیا؟ باوجودیکہ وہ علم رکھتا ہے مگر اللہ نے اسے گمراہ کردیا، اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگادی، اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب اللہ کے بعد کون ہے جو اس کی رہنمائی کرے گا؟
وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸: ۵۰)	اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

نزول قرآن کے زمانے میں دوسرے گروہ کے نمایندے بنی اسرائیل تھے۔ اپنے آپ کو موسوی اور متبع توراۃ کہا کرتے تھے۔ مگر عقائد اور معاملات میں اکثر و بیشتر موسیٰ علیہ السلام کے طریقے اور توراۃ کی تعلیم کے خلاف تھے اس پر لطف یہ تھا کہ اپنے اس انحراف پر نادم بھی نہ تھے۔ بجائے اس کے کہ اپنے خیالات اور اعمال کو توراۃ کے مطابق ڈھالتے وہ توراۃ میں لفظی و معنوی تحریفیں کرکے اس کو اپنے افکار و اعمال کے مطابق ڈھال لیا کرتے تھے توراۃ کی اصلی تعلیمات کو چھپا کر اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ گویا وہی دراصل توراۃ کی تعلیمات ہیں خدا کے جو بندے انھیں اس گمراہی پر متنبہ کرتے، اور ان کی خواہشات کے خلاف کلام الٰہی کے اتباع کی طرف دعوت دیتے تھے ان کو وہ گالیاں دیتے، جھوٹا قرار دیتے حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا — وہ الفاظ کو ان کے مواقع سے پھیر دیتے ہیں اور انہوں نے

انسان حیثیت کو انسانیت کا عطر سمجھنے لگے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے یا دنیا میں آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی اندھا دھند پیروی کرنا نہیں ہے ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے قدیم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگیں۔ ہر رہرو کے دامن سے دامن باندھ کر چل کھڑے ہوں خواہ وہ کانٹوں کی طرف جا رہا ہو یا خندق کی طرف ہمیں خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ دنیا کے اچھے اور برے میں تمیز کریں، کھوٹے اور کھرے کو پرکھ کر دیکھیں، کسی کو رہنما بنانے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیں کہ وہ کدھر سے جانے والا ہے۔

اسلام ان تینوں گروہوں کو غلط کار ٹھیراتا ہے۔

پہلے گروہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ نہ تو یہ لوگ کسی روشنی والے کو ہادی و رہنما مانتے ہیں نہ ان کے پاس خود ہی حق کا نور ہے کہ اس کے اجالے میں راہ طے کریں، ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں محض اندازے اور اٹکل سے چل رہا ہو ممکن ہے کہ کہیں سیدھے رستے چلے، اور ممکن ہے کہ کہیں گڑھے میں جا پڑے۔ اس لیے کہ اندازہ کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔ بلکہ زیادہ تر امکان غلطی ہی کا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاءَ ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۱۰ : ۷)	جو لوگ خدا کے سوا دوسرے شرکا کو پکارتے ہیں، جانتے ہو کہ وہ کس طریقے کے پیرو ہیں؟ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض اندازے پر چلتے ہیں۔
اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳ : ۲)	وہ محض گمان پر چلتے ہیں، اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ہدایت سے ذرہ برابر بھی بے نیاز نہیں کرتا۔
اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ	وہ گمان اور اپنے نفس کی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی

حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ
عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ
(۵ : ۳)

بہت سی ان نصیحتوں کو بھلا دیا ہے جو انھیں کی گئی تھیں
تجھے برابر ان کی کسی نہ کسی چوری کی اطلاع ملتی رہتی ہے کہ
خیانت سے ان کے بہت کم آدمی بچے ہوئے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۳ : ۷)

اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو
اور کیوں جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈالتے ہو؟

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ
أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ
(۵ : ۱۰)

جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ایسا پیام لے کر آیا
جو ان کے نفس کی خواہشوں کے مطابق نہ تھا تو کسی کو
انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

اور پھر ان سے صاف کہدیتا ہے کہ:۔

لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (۵ : ۱۰)

تم ہرگز کسی راہ راست پر نہیں ہو تا وقتیکہ توراۃ اور انجیل کو
قائم نہ کرو اور اس کتاب کو نہ مانو جو تمہارے رب کے پاس
سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ (یعنی قرآن)۔

تیسرے گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا
بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ
آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ
(۲ : ۲۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ اس ہدایت پر چلو جو اللہ نے
اتاری ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلینگے
جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا وہ اس صورت
میں بھی اپنے باپ دادا کی پیروی کریں گے جب کہ وہ کچھ
نہ سمجھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں؟

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۔ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵:۱۰۴)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف، تو انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا وہ طریقہ اس صورت میں بھی ان کے لئے کافی ہے جبکہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں؟

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶:۱۱۶)

اور اگر تو نے بہت سے ان لوگوں کی پیروی کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے رستے سے بھٹکا دیں گے۔ یہ لوگ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور ان کا طریقہ بالکل اٹکل اور اندازے پر ہے۔

جو لوگ خود اپنی عقل وفہم سے کام نہیں لیتے، خود کھوٹے اور کھرے کو نہیں پرکھتے آنکھیں بند کرکے دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، ان کو قرآن اندھا، گونگا، بہرا، بے عقل قرار دیتا ہے۔ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۲:۱۷۱) اور انھیں جانوروں سے تشبیہ دیتا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر کیونکہ جانور تو عقل رکھتا ہی نہیں، اور وہ عقل رکھتے ہیں مگر اس سے کام نہیں لیتے۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷:۱۷۹)۔

ان تینوں گروہوں کو، جن کے طریقے افراط اور تفریط پر مبنی ہیں، رد کردینے کے بعد قرآن ایسے لوگوں کا ایک گروہ بنانا چاہتا ہے جو اعتدال اور توسط کی راہ پر ہوں، "أُمَّةً وَسَطًا ہوں" قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ ہوں۔

یہ اعتدال اور توسط کی راہ کیا ہے ہے کہ پہلے تم ان سب پردوں کو چاک کردو جو قدیم روایات

اور جدید تعلیمات نے تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈال رکھے ہیں۔ عقل سلیم کی صاف روشنی میں آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز باطل؟ دہریت صحیح ہے یا خدا پرستی؟ توحید صحیح ہے یا شرک؟ انسان راہ راست پر چلنے کے لئے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے یا نہیں ہے؟ انبیاء علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے یا معاذ اللہ جھوٹے؟ قرآن جس طریقے کو پیش کرتا ہے وہ سیدھا ہے یا ٹیڑھا؟ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ خدا کو ماننا انسانی فطرت کا عین مقتضیٰ ہے، اور خدا حقیقت میں وہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے اگر تمہارا ضمیر تسلیم کرے کہ انسان اپنی رہنمائی کے لئے خدا کی بخشی ہوئی روشنی کا یقیناً محتاج ہے، اور یہ روشنی وہی ہے جو نوع بشری کے سچے رہبر انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کو دیکھ کر تم کو یقین آجائے کہ اس اعلیٰ سیرت کا انسان ہرگز دنیا کو دھوکہ نہیں دے سکتا اور انہوں نے جب رسول خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو وہ ضرور اپنے دعوے میں سچے ہیں، اگر قرآن کا مطالعہ کر کے تمہاری عقل یہ فیصلہ کر دے کہ انسان کے لئے اعتقاد اور عمل کا سیدھا راستہ وہی ہے جو اس کتاب نے پیش کیا ہے۔ اور یہ کتاب یقیناً کلام الٰہی ہے۔ تو تمام دنیا کی ملامت و مخالفت سے بے خوف ہو کر، ہر نقصان کے ڈر اور فائدے کے لالچ سے دل کو پاک کر کے اس چیز پر ایمان لے آؤ جس کی صداقت پر تمہارا ضمیر گواہی دے رہا ہے۔

پھر جب تم نے عقل سلیم کی مدد سے حق اور باطل میں تمیز کر لی، اور باطل کو چھوڑ کر حق پر ایمان لے آئے تو عقل کے امتحان اور اس کی تنقید کا کام ختم ہو گیا۔ ایمان لانے کے بعد فیصلہ کرنے اور حکم دینے کا اختیار عقل سے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف منتقل ہو گیا۔ اب تمہارا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ ہر اس حکم کے آگے سر جھکا دینا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے تم کو دیا ہے۔ تم اپنی عقل کو ان احکام کے سمجھنے ان کی باریکیوں اور حکمتوں تک پہنچنے، اور ان کو اپنی زندگی کے جزئیات پر منطبق کرنے میں استعمال کر سکتے ہو

اگر کسی حکم خداوندی میں چون و چرا کرنے کا تم کو حق نہیں ہے۔ خواہ کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے خواہ کوئی حکم تمہاری عقل کے معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، خواہ اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ تمہیں اپنی دنیوی اغراض کے لحاظ سے مفید نظر آئے یا غیر مفید، خواہ اللہ کا ارشاد اور رسول کا فرمان دنیا کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے مطابق ہو یا منافی، تمہارا کام بہر حال اس کے آگے سر جھکا دینا ہے۔ کیونکہ جب تم نے خدا کو خدا مان لیا، رسول کو خدا کا رسول تسلیم کر لیا اور یہ یقین کر لیا کہ خدا کا رسول جو کچھ پیش کرتا ہے، خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے۔ اپنے دل سے گھڑی ہوئی کوئی بات پیش نہیں کرتا۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، تو اس یقین و اذعان کا عقلی نتیجہ یہ ہے کہ تم خود اپنی عقل کے فیصلوں پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے فیصلوں کو ترجیح دو، اور جو عقائد یا امر و نہی کے احکام خدا کی طرف سے خدا کے رسول نے بیان کئے ہیں۔ ان کو اپنی عقل، اپنے علم، اپنے تجربات، یا دوسرے اہل دنیا کے افکار و اعمال کے معیار پر جانچنا چھوڑ دو۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں مومن ہوں اور پھر چون و چرا بھی کرتا ہے، وہ اپنے قول کی آپ تردید کرتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ ایمان اور چون و چرا میں کھلا ہوا تناقض ہے۔ اور اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ڈسپلن صرف ماننے اور اطاعت کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ چون و چرا کا دوسرا نام انارکی ہے۔

اسی اعتدال اور توسط کے طریقہ کا نام "اسلام" ہے۔ اور جو گروہ اس راستہ پر چلتا ہو اس کا نام "مسلم" ہے۔

اسلام کے معنے انقیاد، اطاعت، اور تسلیم کے ہیں۔ اور "مسلم" وہ ہے جو حکم دینے والے کے امر اور منع کرنے والے کی نہی کو بلا اعتراض تسلیم کرلے۔ پس یہ نام خود ہی اس حقیقت کا پتہ دے رہا ہے کہ آنحضرت کے متبعین گروہوں اور ان کے طریقوں کو چھوڑ کر یہ جو تھا گروہ ایک نئے مسلک کے ساتھ اسی لئے قائم کیا گیا ہے کہ یہ خدا اور رسول کے حکم کو ماننے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ اس گروہ کا کام یہ نہیں ہے کہ ہر معاملے میں

صرف اپنی عقل کی پیروی کرے، نہ یہ ہے کہ احکام الٰہی میں سے جو کچھ اسکی اغراض کے مطابق ہو اس کو مانے اور جو اغراض کے خلاف ہو اس کو رد کردے، نہ یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کو چھوڑ کر انسانوں کی اندھی تقلید کرے خواہ وہ انسان مردہ ہوں یا زندہ۔

اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں وہ کہتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول کا حکم آجائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (۳۳ : ۵)

کسی مومن اور مومنہ کا یہ کام نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کے لئے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

وہ کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ ماننا اور کچھ کو رد کردینا، دنیا و آخرت میں رسوا کن ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲ : ۱۰)

کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو۔ اور آخرت میں ایسے لوگ شدید تر عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں ہے۔

وہ کہتا ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الٰہی کے مطابق ہونا چاہئے، خواہ وہ لوگوں کی خواہشات کے

مطابق ہو یا نہ ہو :—

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ
أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵:۷) نے اتاری ہے اور جو کچھ تیرے پاس حق تعالی کی طرف سے
آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

وہ کہتا ہے جو شخص کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا
أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵:۷) اور ہر فیصلہ جو کتاب الٰہی کے خلاف ہے۔ جاہلیت
کا فیصلہ ہے۔ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۵:۵)

وہ کہتا ہے کہ "اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول اور اپنے اولی الامر کی اطاعت
کرو۔ اور اگر تم حقیقت میں اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو تو جس کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع
پیدا ہو، اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ یہی بہتر طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے
بھی یہی اچھا ہے۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب
پر جو تیری جانب بھیجی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے بھیجی گئی تھیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا کے
نافرمان انسان کو اپنے معاملہ میں حکم بنائیں حالانکہ انھیں اس کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان
تو یہ چاہتا ہی ہے کہ انھیں بھٹکا کر راہ راست سے دور ہٹا لے جائے۔ جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ
اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقین کو دیکھا کہ وہ تجھ سے
کنی کاٹ جاتے ہیں۔ .... ہم نے جو رسول بھیجا ہے، اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق
اس کی اطاعت کی جائے۔ .... نہیں! تیرے پروردگار کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک
کہ وہ اپنی باہمی اختلافات میں تجھ کو حکم نہ بنائیں۔ اور یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ جو فیصلہ
تو کرے اس پر وہ اپنے دل میں کسی قسم کی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور بے چون و چرا اس کے آگے سر

جھکا دین" (۴: ۸ - ۹) -

ان تصریحات سے "اسلام" اور "مسلم" کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی - اب ہم سب لوگوں کو جنھوں نے مردم شماری میں اپنے آپ کو "مسلمان" لکھوایا ہے، غور کرنا چاہئے کہ ہم پر لفظ "مسلم" کا اطلاق کس حد تک ہوتا ہے اور جس طریقہ پر ہم چل رہے ہیں اس کو "اسلام" سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟

محرم کے پرچہ میں ایک مدرسۃ القرآن کے قیام کی تجویز کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ الحمد للہ کہ وہ تجویز اب عملی صورت میں آیا چاہتی ہے۔ نصاب تعلیم تیار کر لیا گیا ہے اور اہل الرائے حضرات کے پاس مشورے کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ جب وہ ایک آخری شکل اختیار کر لیگا تو ناظرین ترجمان القرآن کی اطلاع کے لئے شائع کر دیا جائیگا۔ تجویز یہ ہے کہ مدرسہ میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ لے جائیں جو بی۔ اے۔ کے درجہ تک انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کر چکے ہوں اور اس کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف ہوں۔ ان کو قرآن مجید کی تعلیم قدماء کے اسلوب پر بالکل نئے انداز میں دی جائیگی مطمح نظر یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی مدد سے ان میں فکر اسلامی پیدا کی جائے۔ وہ اسلامی نظر سے دنیا اور اس کے تمام معاملات کو دیکھیں۔ اسلامی طریق پر سوچیں۔ اور اسلامی طریق پر زندگی کے مسائل کو حل کریں۔ تعلیم میں حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، تاریخ اسلام، سیاسیات، معاشیات وغیرہ تمام ضروری علوم ہوں گے، مگر سب کا مرکز قرآن ہوگا۔

درس میں ہر وہ طالب علم شریک ہو سکے گا جو اپنی زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہو اور جس کا مقصد حیات محض دنیا طلبی نہ ہو۔ مگر خاص طور پر ایسے طلبہ کا انتخاب پیش نظر ہے جو انگریزی، عربی اور اردو جاننے کے ساتھ ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی زبانوں میں سے بھی کوئی زبان اچھی طرح جانتے ہوں، مثلاً بنگالی، مرہٹی، گجراتی، تلنگی، تامیل وغیرہ کیونکہ آگے چل کر ان لوگوں سے ہندوستان کی دیسی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ کا کام لینا مقصود ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف دیسی زبانیں جاننے والے ۱۲ طلبہ منتخب کئے جائینگے اور ان کے کل مصارف کا کفیل خود مدرسہ ہوگا

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۷)

ایمان

نظریہ حیات، اور مقصدِ حیات سے گذر کر اب ہمارے سامنے تیسرا سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے انسانی سیرت کی تعمیر کس بنیاد پر کی ہے؟

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد انسان کے جملہ اعمال و افعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں، مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں، اور ان میں سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے لئے محرک بن جائے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے، بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو، اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب و منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ پہلی حالت کو ہم ایک سڑک سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ہر آیند و روند کے لئے کھلی ہوئی ہے، کسی وارد و صادر کی اس میں تخصیص نہیں۔ اور دوسری حالت ایک ایسے سانچکی سی ہے جس میں سے ہمیشہ ایک متعین شکل و ہیئت کے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی۔ اس کی طبیعت میں تلون ہے، یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کب کس قسم کے فعل کا صدور ہو۔ بخلاف اس کے جب وہ دوسری حالت میں آجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی ایک سیرت رکھتا ہے اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے۔ ایک ترتیب ہے۔ اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کن حالات میں کیا

فعل کرے گا۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط پس معلوم ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے، اور سیرت کے بننے کا انحصار اس پر ہے کہ انسان کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متمکن ہو جائیں، اور ان خیالات میں اتنا رسوخ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آنے اور ذہن کی دنیا میں برہمی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے، سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب منظم اور قابل اعتماد ہوگی۔ برعکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہوگی، مخالف خیالات کو راہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی، اتنی ہی سیرت بھی کمزور ہوگی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابل وثوق ہو جائیگی۔

ایمان کے معنی قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام "ایمان" ہے ایمان کا لفظ مادۂ "امن" سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے جو ضد ہے خیانت کی۔ یعنے امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہ کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو اَمُون کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اسی مادے کا باب افعال "ایمان" ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جم جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا۔ اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوئی۔ اور اسی نے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا کر دی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا عکس ہے مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس

اور یقینی بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک اُس تخیل اور اُس مفکورہ کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے۔ اور جس سے سیرت کا سانچہ طیار ہوا ہے۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں، اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی حیثیت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دیگا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے تھے چونے سے جوڑ دیئے گئے۔ اور ایک مضبوط دیوار قائم ہوگئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائیگا۔ جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں ایک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہوگا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی ایک نئی قوم نئی سیرت نئی ذہنیت، نئے خیالات نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور اپنی حضریت کا قصر ایک نئے ہی انداز پر تعمیر کرے گی۔

اس تقریر سے آپ نے سمجھ لیا کہ ایک تہذیب میں اس اساسی تخیل کا کیا مرتبہ ہے جو اجتماعی طور پر اس تہذیب کے متبعین میں ایمان بن کر راسخ ہو جاتا ہے۔

ایمان کی دو قسمیں

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ایمان کے اعتبار سے دنیا کی مختلف تہذیبوں کا کیا حال ہے ایمان کا لفظ اصل میں تو ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ مگر چونکہ یہاں ہم اس کو اساسی تخیل کے معنی میں بول رہے ہیں اس لئے اس معنی میں ایمان کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جو مذہبی نوعیت رکھتا ہو۔ اور دوسرا وہ جو دنیوی نوعیت رکھتا ہو۔ مذہبی نوعیت کا ایمان صرف اس تہذیب کی اساس بن سکتا ہے۔ جس کی بنیاد مذہب پر ہو کیونکہ اس صورت میں ایک ہی ایمان دین اور دنیا دونوں پر حکمران رہتا ہے مگر جس تہذیب کی بنیاد

مذہب پر نہ ہو تمہیں دنیوی ایمان مذہبی ایمان سے الگ ہو جاتا ہے اور مذہبی ایمان کا شخصی و قومی زندگی پر کوئی اثر باقی نہیں رہتا

مذہبی ایمان مذہبی ایمان عموماً ایسے امور پر ہوتا ہے جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں، مثلاً ایک یا متعدد معبود جن کو مخصوص صفات سے متصف کیا گیا ہو کتابیں جن کا الہامی ہونا تسلیم کر لیا گیا ہو اور پیشوا جن کی تعلیم پر اعتقاد و عمل کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ دینی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اس قسم کے ایمان کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ مذہب نے جن امور کی تصدیق کرنے اور جن پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا ہے وہ عقلی اعتبار سے قابل تصدیق ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے امور ہوں جن کی بنیاد پر انسانی سیرت کی تعمیر صحیح طور سے ہو سکتی ہو یعنی وہ سیرت کو اس طرح سے بنائیں کہ اس کی روحانیت ایک اعلیٰ درجہ کے نظام اخلاق کی تاسیس کرنے والی ہو، اور اس کا اخلاق اپنی پاکیزگی و طہارت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد کرنے والا ہو۔

پہلی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانیات محض اوہام کا مجموعہ ہوں، یا ان میں اوہام زیادہ اور معقولات کم ہوں، تو انسان کے ذہن پر ان کا استیلا کلیۃً جہالت و نادانی کا زیر بار منت رہیگا۔ یہی کہ ارتقائے عقلی کے بلند مدارج کی طرف انسان نے قدم اٹھایا۔ اور بس اوہام باطلہ کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو گیا ایمان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اور اس کے ساتھ ہی روحانیت اور اخلاق کا وہ سارا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا گیا جس پر شخصی اور قومی سیرت کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں۔ اس کی مثال میں ہم ان عقائد اور اوہام کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف مذاہب نے دیوتاؤں، معبودوں، خداؤں اور پیشواؤں کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ان کو جن صفات سے متصف کیا گیا ہے، جو افعال ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، جو فسانے ان کے متعلق گھڑے گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ عقل سلیم ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان پر اعتقاد رکھنے والی قوم دنیا میں ترقی اور غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ باطل اوہام اس کے ذہن پر ایسا بڑا اثر ڈالتے ہیں کہ عمل کی بہترین قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ نہ حوصلوں

میں بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ عزائم میں شدت، نہ نگاہ میں وسعت، نہ دماغ میں روشنی، نہ دل میں جرأت آخرکار
یہی چیز اس قوم کے لئے دائمی نکبت، ذلت، مقہوری اور غلامی کا سبب بن جاتی ہے۔ برعکس اس کے جن قوموں
پر کچھ دوسرے اسباب سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں وہ عقل و علم کے اعتبار سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اپنے
خداؤں، معبودوں، اور پیشواؤں پر سے ان کا اعتقاد اٹھتا جاتا ہے۔ اول اول نظام اجتماعی کی حفاظت
کے لئے ان غلط ایمانیات کو محض مصلحۃً برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف
دل اور دماغ کی بغاوت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ آخرکار قوم کے ذہن پر ان کے لئے کوئی گرفت باقی نہیں
رہتی۔ صرف ایک مختصر سا روحانی گروہ ان پر یقین رکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے، اور باقی ساری قوم کے
نفس و روح پر ایک دوسرے ایمان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کو ہم نے دنیوی ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شرط کا ضروری ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جو ایمانیات انسان کو دنیوی زندگی میں کامیابی
حاصل کرنے کے لئے طیار نہیں کر سکتے ان کا اثر محض روحانی اور اخلاقی زندگی تک محدود رہتا ہے، مادّی زندگی
تک نہیں پہنچنے پاتا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کی بدولت وہ قوم ترقی ہی نہ
کرے گی جو ان کی معتقد ہوگی۔ یا ترقی کرے گی تو بہت جلدی ان کی گرفت سے نکل جائے گی۔ مذہب کا ایمان
تہذیب کے ایمان کے لئے جگہ خالی کر دے گا، اور جب مادّی زندگی کی سعی و عمل میں قوم کا انہماک بڑھے گا
تو اخلاق و روحانیت بھی مذہبی ایمانیات کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔

میں عمداً کسی مذہب کی تنقیص کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ مختلف مذاہب کے
ایمانیات پر کوئی کلام نہ کروں گا۔ آپ مذاہب کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا
کہ کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات نے ان کے معتقدین کو دنیوی زندگی میں ترقی کرنے سے روکا ہے اور کس طرح بعض مذاہب کے
ایمانیات علم و عقل کی ترقی کا ساتھ نہ دے سکے؟ پھر یہ بھی آپ دیکھیں گے کہ دوسری قوموں نے تنزل کی حالت میں اپنی مذہبی معتقدات
پر ایمان رکھا اور ترقی کی حالت میں ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ایمان

میں سب سے زیادہ مضبوط اس وقت تھے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور ان کے ایمان میں کمزوری آئی تو اس وقت جب کہ وہ عقل میں، علم میں، دنیوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان پر غالب آگئیں۔ آج مسلمان انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ ضعف ایمانی کے مرض میں بھی شدت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے وہ انتہائی ترقی کی حالت میں تھے، اور اس کے ساتھ اپنے مذہبی ایمان میں انتہا درجے کے مضبوط بھی تھے۔ بخلاف اس کے یورپ کے مسیحی اور جاپان کے بودھی جب پکے مسیحی اور بودھی تھے تو حد درجہ تنزل کی حالت میں تھے اور جب انہوں نے ترقی کی تو مسیحیت اور بودھیت پر ان کا ایمان نہ رہا۔ یہ اسلام کے ایمانیات اور دوسرے مذاہب کے ایمانیات کا ایسا نمایاں فرق ہے جس کو بادنیٰ تامل ہر صاحب عقل و بصیرت انسان محسوس کر سکتا ہے۔

دنیوی ایمان اب دوسری طرف ان ایمانیات پر نظر ڈالیے جن کو ہم دنیوی ایمانیات سے تعبیر کر رہے ہیں ان میں کوئی مذہبی عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی خدا ہے، نہ کوئی مذہبی پیشوا، نہ کوئی الہامی کتاب، نہ کوئی ایسی تعلیم جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے والی ہو۔ یہ خالص دنیوی امور ہیں۔

ان میں سب سے بڑی چیز "قوم" ہے۔ جسے ایک خاص رقبے کے رہنے والے لوگ معبود بنا کر پورے خلوص و انہماک کے ساتھ پوجتے ہیں، تمام "قوم پرست" اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قوم ان کے جان و مال کی مالک ہے، اس کی خدمت و حفاظت فرض ہے، اس کی خدمت میں جان دینا اور اس پر تن من دھن نثار کر دینا عین سعادت ہے، اور یہی نہیں بلکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انہی کی قوم برحق ہے، وہی زمین کی وارث اور مستحق ہے، دنیا کی تمام زمینیں اور دنیا کی ساری قومیں اس کے لئے غنائم اور رعایا کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر شخص کا فرض ہے کہ سارے جہان میں اپنی قوم کا علم بلند کرے۔

دوسرا معبود ملک کا "قانون" ہے جس کو وہ خود بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی عبادت ان کے اجتماعی ضبط و نظم کی ضامن ہے،

تیسرا معبود ان کا "اپنا نفس" ہے جس کی پرورش، جس کی حاجات و ضروریات کی تکمیل، اور جس کے داعیات و خواہشات کی تحصیل ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

چوتھا معبود "علم و حکمت" ہے جس پر وہ ایمان لاتے ہیں، جس کی روشنی میں چلتے ہیں، اور جس کی رہنمائی میں ترقی کی راہ پر گام زن ہوتے ہیں۔

یہ ایمانیات یقیناً دنیوی زندگی کے لئے ایک حد تک مفید ہیں مگر قطع نظر اس کے کہ حق اور صداقت کے اعتبار سے ان کا کیا مرتبہ ہے خالص دنیوی نقطۂ نظر سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فائدہ نہ حقیقی ہے، نہ پائدار۔ ان کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں کوئی روحانی و اخلاقی عنصر شامل نہیں ہوتا اسلئے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے ہی اخلاقی مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قانون کا یہ منصب نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حاسۂ اخلاقی پیدا کرے اور صحیح معنوں میں اخلاق کا کوئی معیار قائم کر دے۔ نہ اس میں اتنی قوت ہے کہ شخصی و اجتماعی زندگی میں اخلاق کی حفاظت کر سکے، اس کا اثر اور دائرۂ عمل محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ قانون جس کو لوگ خود بناتے ہیں، اس معاملہ میں اور بھی زیادہ بے بس واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ ایسے قانون کی گرفت کو تنگ اور ڈھیلا کرنا تو لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے جتنی جتنی آزادی عمل کی خواہش لوگوں میں بڑھتی جاتی ہے، پرانی اخلاقی بندشیں تنگ اور ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور جب کسی اخلاقی بندش کے متعلق یہ احساس عام ہو جاتا ہے، تو رائے عام کا دباؤ قانون کو اپنے بند ڈھیلے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اخلاق کے سارے بند کھل جاتے ہیں ایک عام اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور اخلاقی انحطاط وہ چیز ہے جس کے مہلک اثرات کو نہ دولت کی فراوانی روک سکتی ہے، نہ حکومت کا زور، نہ مادی وسائل کی قوت، نہ علم و حکمت کی تدابیر۔ یہ ایک گھن ہے جو اندر سے لگنا شروع ہوتا ہے۔ اور مضبوط سے مضبوط عمارت کو اس کے تمام ساز و سامان سمیت لے بیٹھتا ہے۔

ان کے علاوہ قوم پرستی اور نفس پرستی کے جو دوسرے مفاسد ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے بیان میں کچھ زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں ہے۔ اب تو ان کو سمجھنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں

رہی، وہ نظریات سے گذر کر محسوسات و مشاہدات کے درجہ میں آ گئے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج انہی کی بدولت ایک بہت بڑی تہذیب ہلاکت و بربادی کے سرے پر پہنچ گئی ہے۔ اور وہ انہی کے نتائج ہیں جن کے یقینی ظہور کا اندیشہ آج تمام دنیا کو لرزہ براندام کیے ہوئے ہے

چند اصول کلیہ اس تمام بحث سے چند اصول کلیہ مستنبط ہوتے ہیں جن کو آئندہ مباحث کی طرف تجاوز کرنے سے پہلے ایک ترتیب صحیح کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

(۱) انسانی اعمال کا منضبط اور منتظم ہونا، منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ کسی مستقل سیرت کے بغیر انسان کی عملی زندگی پراگندہ، متلوّن، اور ناقابل وثوق رہتی ہے۔

(۲) سیرت کی بنیاد ان تصورات پر ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں، اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہیں کے زیر اثر رہ کر کام کرنے لگیں۔ اس رسوخ کا اصطلاحی نام "ایمان" ہے، اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ہم "ایمانیات" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۳) سیرت کی اچھی اور بری صحیح اور غلط مضبوط اور کمزور تشکیل، کلیۃً انہی "ایمانیات" کی نوعیت اور ان کے رسوخ ایمانی پر منحصر ہے۔ ایمانیات صحیح ہوں تو سیرت بھی صحیح ہو گی، ایمان مضبوط ہو تو سیرت بھی مضبوط ہو گی۔ ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہو گا۔ لہذا انسان کی زندگی کو ایک صحیح اور اعلیٰ درجہ کے نظم میں لانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی سیرت کو ایک صحیح اور مضبوط ایمان پر قائم کیا جائے۔

(۴) جس طرح شخص واحد کے اعمال حیات کو پراگندگی سے نکال کر ضبط اور نظم کے تحت لانے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص کو انتشار اور تفرقہ کی حالت سے نکال کر ایک منظم اور متحد جمعیت بنا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب کے دلوں میں ایک ہی مشترک ایمان بٹھا دیا جائے پس تمدن کا مفاد اس کا مقتضی ہے کہ ایمان کا معاملہ محض شخصی نہ رہے، بلکہ قومیت کا رشتہ اتحاد بن جائے

۵۔ جب ایک مشترک ایمان کے زیر اثر بہت سے افراد میں ایک مشترک قومی سیرت بن جاتی ہے، اور اس سیرت کے اثر سے ان کی زندگی کے اعمال میں ایک طرح کی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر تہذیب کی تاسیس اور تشکیل میں ان ایمانیات کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

(۶) جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں، اور جس کے ایمانیات دنیوی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

(۷) تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے

(۸) تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لیکر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقلی کا ساتھ دے سکیں اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی، بلکہ اس کی دنیا داری عین دینداری ہو اور دین داری، عین دنیا داری۔

(۹) جس قوم کا مذہب و تہذیب دونوں ایک ہوں، اس کا ایمان نرا مذہبی ایمان ہی نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے، اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔

یہی وہ اصول کلیہ ہیں جن کے لحاظ سے ہم کو ایمان کے متعلق اسلام کے موقف پر تنقیدی نگاہ ڈالنی ہے۔

(باقی)

کرشمۂ قدرت

از مولانا عبداللہ العمادی

کائنات کی ہر چیز اپنی قدرت و اقتدار کی نمائش چاہتی ہے مگر مُبدع کائنات کی قدرت کاملہ کی نموداریوں کو دیکھتی ہی نہیں، اور اگر غلط انداز نظروں سے دیکھ بھی لیا تو آمادۂ تکذیب ہوگئے آج کی صحبت میں اسی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے جس کو سمجھنے اور جس سے عبرت حاصل کرنے کے لئے پہلے آپ سورۂ رحمان کی تلاوت کرلیجئے اور پھر اُس رحمان و رحیم کی قدرت دیکھئے۔

(۱)

سورۂ رحمان میں جا بجا فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کا تنبیہی فقرہ وارد ہوا ہے جس کے معنی "اے جماعت جن و انسان تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے" بتلائے جاتے ہیں۔ اس فقرہ کا نسق اس طرح واقع ہوا ہے کہ پہلے خدا کی نعمتیں مذکور ہیں۔ پھر ان پر متنبہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاکِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔

اور (اسی خدا نے) خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنادی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں) پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوتے ہیں اور (طرح طرح) کے اناج جو (بھوسی کے) خول میں ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو (اے جماعت جن و انسان) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے؟

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس فقرہ کے قبل جابجا ایسی ترہیب و تہدید کی آیتیں بھی وارد ہیں جن سے نعمت و رحمت کا مفہوم مشکل سمجھ میں آسکتا ہے ۔ مثلاً :

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلَانِ ۝ فَبِاَيِّ
اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا
لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ
مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۔ فَبِاَيِّ
اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ
السَّمَاۗءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ
فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ فَيَوْمَئِذٍ[1]
لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَاۗنٌّ ۔
فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ يُعْرَفُ
الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ
وَالْاَقْدَامِ ۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ
يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ فَبِاَيِّ
اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ (آیت ۱۵ - ۲۲)

اے دونو گروہو عنقریب ہم تمہاری طرف کلیۃً متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے تم دونوں مکرتے رہوگے۔ اے گروہ جن و انس اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں (ہو کر کہیں کو) نکل بھاگو تو نکل دیکھو مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو (اور وہ تم میں نہ ہے اور نہ ہو) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تم پر آگ کی کچی پکی لو برسائی جائیگی کہ تم (اس کو) دفع نہ کر سکوگے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے مکرتے رہوگے پھر جب (قیامت کے دن) آسمان پھٹا اور تیل کی طرح (اس کی رنگت) لال ہوئی (وہ آخری فیصلہ کا دن ہوگا)، تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تو اس دن نہ تو گنہگار کے گناہ کی بابت کسی آدمی سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی جن[1] سے تو اے دونو گروہو تم خدا کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے! اس دن گنہگار

لہ: ترجمہ ہم نے سب سے الگ ہو کر اس لئے کیا ہے کہ امام رازی نے اس آیت کی ترکیب میں ایک مشکل پیدا کر کے۔ بقیہ بر صفحہ ۲۶

ان کی صورت سے پہچان لیا جائے گا۔ پھر (ان کے) چٹھے اور پاؤں پکڑے جائیں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ یہ ہے وہ جہنم جس کو گنہگار لوگ جھٹلاتے ہیں (اور قیامت کے دن) اس میں اور کھولتے ہوئے پانی میں (بیقرار پڑے) پھریں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے "

اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کوشش ہونے لگی کہ جس طرح ہو سکے وعید آخرت و عذاب جہنم وغیرہا سے بھی نعمت کی شان پیدا کی جائے اور ثابت کیا جائے کہ لوگ جس چیز کو عذاب سمجھ رہے ہیں اس میں بھی نعمت و رحمت کی ادائیں ہیں۔ اس بنا پر تاویلات ذیل غور طلب ہیں:-

الف جن و انس کی جانب عذاب و ثواب پہنچانے کے لئے خدا کا متوجہ ہونا خود ہی نعمت ہے۔ اس سے بڑی اور نعمت کیا ہوگی کہ مطیع کو ثواب اور منکر کو عذاب دیا جائے گا۔ [1]

(ب) آسمان و زمین کے دائرہ سے باہر نکل جانے کی دھمکی بھی نعمت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے جن و انس کے درمیان اس بات میں برابری کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ارادات و احکام کے خلاف نہ جن کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ انسان۔ [2]

(ج) آگ کی کچی پکی لو برسائی جانے اور آسمان پھٹنے اور لال ہونے میں کوئی تاویل نہ چل سکی اور نعمت کا مفہوم ان چیزوں سے کسی طرح نہ نکل سکا۔ اس لئے علامہ ابن جریر نے اس آیت میں نعمت کی تاویل نظر انداز کر دی [3]، مگر دوسرے مفسرین یہی کہتے چلے جاتے ہیں اور نعمت کا مطلب نکالنے کے باب میں خاموش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۔ اس کے دو جواب دئے ہیں۔ پہلا جواب ان کی رائے میں معمولی ہے اور دوسرے جواب کی نسبت لکھتے ہیں۔ "و۔ وثانیہما وہو الادق و بالقبول احق ان یجعل ما بعد الیہ الضمیر قبل الفعل یتعالی تقدیرہ" فالمذنب یومئذ لا یسأل عن ذنبہ انس ولا جان" ملاحظہ ہو جلد ۷ صفحہ ۲۵۔

[1] ابن جریر۔ جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۷۱۔

[2] ابن جریر جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۷۲ و اول صفحہ ۷۱

[3] ابن جریر۔ صفحہ ۷۴

ہو جاتے ہیں۔

(د) گنہگار کے گناہ کی بابت کسی دوسرے سے سوال نہ ہونا اس لئے نعمت ہے کہ صرف گنہگار پر عذاب ہوگا اور بے گناہ بری رہیں گے

(ھ) گنہگاروں کی پہچان قائم رہنا اور ان کی پکڑ دھکڑ ہونا بھی نعمت ہے کہ انہیں کی ذلت واہانت ہوئی اور دوسرے بچ گئے [۱]۔

(و) گنہگاروں کا جہنم سپرد کرنا اور انھیں کھولتے پانی میں ڈالنا بھی نعمت ہے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق تھے [۳]۔

(ز) نعمتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔

ایک نعمت ضروریات زندگی کا پیدا کرنا ہے مثلاً زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس کا پیدا کرنا بھی نعمت ہے یہ نہ ہوتی تو جگہ رہنے کے لئے کہاں سے آتی۔

نعمت کی دوسری قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کو بلا واسطہ ضروریات زندگی میں داخل کرنا تو مشکل ہے۔ مگر ہماری ضرورتوں میں کاربر آری کے لئے اُن کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مثلاً نظام شمسی کی حرکت اور سیاروں کی چال کہ بغیر ان کے نہ موسم بدل سکتے ہیں۔ اور نہ غلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

تیسری قسم کی نعمت وہ ہے کہ گو محتاج الیہ نہ سہی مگر مفید ضرور ہے۔ مثلاً دریاؤں کا پیدا کرنا اور کشتیاں چلانا۔

چوتھی قسم کی وہ نعمت ہے کہ چاہے مفید نہو۔ مگر ان سے ایک طرح کی آرائش ہوجایا کرتی ہے۔ جیسے لعل و گوہر

یہ چاروں نعمتیں تو قوائے جسمانی کے متعلق ہوئیں۔ پانچویں نعمت جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ خدا نے یہ جسمانی نعمتیں بھی انسان کو عنایت کیں اور ان سب سے اعلیٰ ایک روحانی نعمت بھی عطا فرمائی یعنی علم و

---

[۱] ابن جریر صفحہ ۷۵؛ [۲] ابن جریر۔ صفحہ ۷۵؛ [۳] ابن جریر صفحہ ۷۶۔

تعلّم الرحمن علّم القرآن خلق الانسان علّمه البیان۔

یہ ہیں وہ تاویلیں جن کی بنا پر فبای آلاء ربکما تکذبان میں لفظ "آلاء" کو نعمتوں کا مرادف ثابت کیا گیا ہے لیکن کیا اس حد تک پہنچ کر تحقیق کا خاتمہ ہو گیا اور آگے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہی اس کی تنقیح کے لئے ایک ذرا تامل کرنا چاہئے۔

(۲)

ان تاویلات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اس لئے کہ منکروں پر عذاب ہونا ممکن ہے کہ مطیع بندوں کے لئے رحمت و نعمت ہو کہ بارے اس بلا و مصیبت میں وہ ہی مبتلا ہوئے جو اس کے مستحق تھے غیر مستحق بچ تو رہے لیکن سوال یہ ہے کہ عذاب جہنم کی وعید تو صرف منکروں سے مخصوص ہے مطیع و مومن کو اس سے کیا تعلق آگ کی کچی پکی تو انھیں جن و انس پر برسائی جائے گی جنھیں خدا کی خدائی سے انکار تھا اور دنیا میں وہ اس کی عظمت و جبروت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ آیات میں انھیں منکروں سے خطاب بھی ہے اور انھیں کو ڈرایا بھی گیا ہے ظاہر ہے کہ انکا گرفتار بلا ہونا دوسروں کے لئے نعمت ہو تو ہو خود ان کے لئے کسی طرح بھی نعمت نہیں۔ اور دوسروں کا جب یہاں تعلق ہی نہیں تو یہ بیل منڈھے چڑھے تو کیونکر؟ خطاب جو منکرین و مکذبین سے مستحق عذاب ہوں منکرین و مکذبین۔ عذاب میں خود ان کے لئے کسی قسم کی نعمت و رحمت کا شائبہ نہو۔ بایں ہمہ صرف برائی نعمت کو یاد دلا دلا کے ان پر مار پڑے۔ وہی مثل ہوئی کہ ہمسایہ کو خلعت ملا اور مار مجھ پر پڑی کہ تو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا اور احسان نہیں مانتا۔ رہی نعمتوں کی فیلسوفانہ تقسیم۔ تو اس میں ہزار نکتے نکالے جائیں۔ اگر یہ باتیں اس وقت مفید ہو سکتی ہیں جب پہلے یہ ثابت ہولے کہ منکروں کا آگ میں جلایا جانا خود ان منکروں کے لئے رحمت نہیں ہے رحمت ہے۔ یہ کیا کہ رحمت کا تعلق مومنین سے ہو اور اس کا احسان کفار پر جتایا جائے یہ تو لسان الغیب کی داد خواہی ہوی کہ سے۔

ٖله تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۵

خدا را داد من بستاں از واے شحنۂ مجلس
کہ مے با دیگراں خوردہ است و با من سرگراں دارد

(۳)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہر آیہ اور ہر سورہ اپنے ماقبل وما بعد سے مربوط و منتظم ہے۔ سورۂ رحمٰن سے پہلے سورۂ قمر ہے جس میں چاند جیسے عظیم الشان کرہ کے پھٹنے۔ فضائے آسمان کے پٹ کھولنے اور بڑی بڑی جبار اقوام کے پامال و فنا کر دینے کے اشارے ہیں اور ان سب کے تذکرہ سے خدا نے بندوں پر اپنی عظمت و جلال و قدرت کا سکہ بٹھایا ہے۔ سورہ رحمٰن کے بعد سورہ واقعہ ہے جس میں قیامت ہونے زمین کے دہل اٹھنے۔ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے بہشتیوں اور دوزخیوں پر رحمت اور عذاب ہونے سڑی گلی ہڈیوں پر گوشت و پوست پہنا کر آدمی بنانے مخلوقات کی شکل و ہیئت بدل دینے۔ و مثل ذٰلک کے تذکرے ہیں اور ان کی بھی یہی غرض ہے کہ کمزور اور خود غلط انسان کو جناب باری کی عظمت و اقتدار کا اندازہ ہو سکے۔ ان دونوں کے بیچ میں سورۂ رحمٰن ہے جس کا افتتاح اس پر ہے:-

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ عَلَّمَهُ الۡبَیَانَ ۔ اَلشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ	اس بڑے رحم والے معبود نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔ اُسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ (گردش میں) ہیں۔ اور بوٹے اور درخت

لہ "نجم" ستارہ کو بھی کہتے ہیں اور بوٹیوں کی جھاڑی کو بھی لیکن ستارے کی نسبت درخت کے ساتھ گل بوٹے کو زیادہ مناسبت ہے اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس و سعید و سُدّی و سفیان سے یہی روایت بھی کی ہے کہ اس آیت میں شجر سے تناور درخت مراد ہے اور نجم سے بوٹیوں کی جھاڑی۔ خود ابن جریر بھی اختلاف کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں۔ واولی القولین قول من قال عنی بالنجم ما نجم عن الارض من نبتٍ لعطف الشجر علیہ فکان بان یکون معناہ لذلک ما قام علی ساق وما لا یقوم علی ساق یسجدان للہ بمعنی انہ تسجد لہ الاشیاء کلھا المختلفۃ الھیأت من خلقہ (یعنی نجم کے معنی میں ستارہ اور بوٹوں کی جھاڑی کے دو قول جو ہیں تو ان دونوں میں یہ قول زیادہ صحیح و صائب ہے کہ "نجم" سے مراد وہ نباتی جھاڑیاں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔ اس لئے کہ لفظ "شجر" اسی پر معطوف ہے۔ گویا مطلب ہوا درخت جو ساق دار ہوتا ہے اور جھاڑی جو بے ساق کی ہوتی ہے دونوں خدا کے آگے سربسجود ہیں۔ جیسے اس کی مخلوقات کی تمام چیزیں جن کی شکل و ہیأت خواہ کتنی ہی مختلف ہو سب اس کی فرمانبرداری کے لئے حاضر ہیں) تفسیر ابن جریر ج ۲۷ صفحہ ۲۲

یَسْجُدَانِ ۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ	یسجود ہیں[1]۔ اور اُسی نے آسمان کو اونچا کیا اور ترازو بنادی
وَضَعَ الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِی	ہے کہ تم لوگ تولنے میں (حد اعتدال سے) تجاوز نہ کرو۔ اور
الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ	انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور کم نہ تولو۔ اور
وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۔ وَالْاَرْضَ	اسی نے خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنا دی ہے کہ
وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاکِهَةٌ	اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں)
وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ ۔ وَالْحَبُّ	پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اور (طرح طرح کے) اناج
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ ۔ فَبِاَیِّ	جو (بھوسی کے) خول میں ہوتے ہیں۔ اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔ خَلَقَ	(اے جن و انسان کے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی
الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ	کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اسی نے انسان (اول)
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ	کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لو
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔ رَبُّ	سے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں
الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ فَبِاَیِّ	سے مکرتے رہوگے۔ (وہی جاڑے اور گرمی میں) آفتاب کے نکلنے کے
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ	دو مختلف مقاموں) اور (ایسے ہی) ڈوبنے کے دو (مختلف)۔

[1] سجدہ سر جھکانے کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ درخت سر جھکاتے اور نہ جھاڑیاں سجدہ کرتیں۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری نے ابورزین و سعید سے روایت کی ہے کہ ظلھما سجود ھما۔ (یعنی درختوں اور جھاڑیوں کا سجدہ یہی ہے کہ ان کا سایا پڑا ابھرتا ہے۔ ابن جریر صفحہ (۶۲) اصل میں سجدہ کے مفہوم میں غایت انکسار و تذلل و فرمانبرداری مضمر ہے۔ اس لئے آیت میں سجدہ سے سر جھکانے کی ہیئات مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم مقصود ہے۔ علامہ ابوالسعود صفحہ (۲۰۲ میں لکھتے ہیں:— "یسجدان ای ینقاد له تعالیٰ فیما یرید بهما طبعًا انقیاد الساجدین من المکلفین طوعًا"۔ مطلب یہ درخت اور جھاڑیاں سجدہ کرتی ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا جس بات کو چاہتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر اس امر میں حکم الٰہی کی مطیع رہتی ہیں اور یہ اطاعت ان کی اسی رنگ کی ہے جس رنگ میں کہ خدا کے مکلف بندے اظہار اطاعت کے لئے سجدہ کرتے ہیں)۔

يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱-۱۳)

مقاموں کا مالک ہے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے" اسی نے دو (طرح کے) دریا نکالے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے انکلتے ہیں ان دونوں میں سے بڑے اور چھوٹے موتی۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے' اور اسی کے ہیں جہاز جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (دکھائی دیتے) ہیں تو (اے دو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اس کرۂ زمین پر جتنے متنفس ہیں سب فنا ہونے والے ہیں اور (صرف) تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی عظمت والی اور بزرگ ذات ہے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔

ا۔ دو دریا نکالنے کے متعلق عجیب عجیب اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ مشکل پسند طبیعتوں کے نزدیک معمولی دریاؤں میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی کہ قرآن میں ان کا تذکرہ ہوتا اس لئے بات یہ پیدا کی کہ دو دریاؤں سے ایک وہ دریا مراد ہے جو آسمان میں ہے اور ایک وہ جو زمین ہے یہ دونوں سال میں ایک مرتبہ ملجایا کرتے ہیں۔

دوسرے فریق نے غالباً یہ سمجھ کر کہ بحر فارس و بحر روم سے مسلمانوں کے تعلقات نہایت وسیع ہیں تعیین کر دی کہ "مرج البحرین" میں خدا نے انہیں دونوں دریاؤں کا ارادہ کیا ہے۔

ابن جریر نے صفحہ ۶۸ میں یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں۔ اور خود ان کی رائے میں پہلی روایت کو ترجیح ہے لیکن اس مشکل پسندی میں پھنسنے کی ضرورت کیا ہے۔ جس چیز کا تعین خدا و رسول نے نہ کیا ہو اور عقل و علم بھی اس کے حامی نہ ہوں اس کو ماننا کیا ضرور ہے۔ کیوں نہ وہ تمام دریا اس سے مراد ہوں جو باہم ملتے ہیں اور پھر بھی جدا رہتے ہیں

(۴)

تاریخ شاہد ہے کہ عجمیت کے غلبہ نے عربیت کے خط وخال تک بدل دیئے اس طوفان میں عربی زبان اور اس کے اسلوب کا برقرار رہ جانا کچھ آسان نہ تھا، الفاظ تو وہی رہے، مگر معانی تبدیل ہوگئے لغویین نے، کہ سب کے سب عجمی تھے اِلّا ماشاء اللہ [illegible] ہوئے معانی لغت میں ثبت کردیے کس کو فرصت کہ کلام جاہلیت کا تتبع کرے اور سمجھے کہ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا اس کے کلمات کا مفہوم اس زبان میں کیا تھا۔

یہی دیکھیے کہ لفظ آلاء کے معنی سب نے نعمتوں کے قرار دیئے ہیں۔ علامہ زمخشری عربی زبان کے ایک مشہور ادیب ہیں اور عربیت میں ان کی دستگاہ مسلم ہے، مگر اپنی تفسیر میں وہ بھی اس سے قدم نہیں بڑھاتے

سے بقیہ صفحہ ۳۱۔ کمال اتصال پر بھی ایک دوسرے سے ممتاز رہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا موقع نہ ملے۔

سے امام رازی نے یہ مانکر کہ آیت مذکورہ میں دو دریاؤں سے میٹھے اور کھارے پانی کے دو دریا مراد ہیں۔ خود ہی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں قسم کے دریاؤں سے موتی کیونکر پیدا ہوسکتے ہیں۔ موتی تو محض دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں میٹھے پانی کے سمندروں میں تو پیدا نہیں ہوتے اس اعتراض کا امام صاحب نے کئی طرح سے جواب دیا ہے۔

(۱) قرآن جب دعوی کر رہا ہے کہ دونوں قسم کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں تو اس کے خلاف انسانی تجربہ ناقابل تسلیم ہے

(۲) بالفرض دریائے شور ہی میں موتی پیدا ہوتے ہوں لیکن آخر پیدا تو صدف کے اندر مینھ کے قطرہ ہی سے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مینھ کو آسمان ہی کے دریا سے تعلق ہے۔

(۳) دونوں دریاؤں سے موتی پیدا ہونے کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہوں تو دونوں میں ہوں۔ کسی ایک میں بھی اگر پیدا ہوں تو مطلب نکل آیا۔ محاورہ میں کہتے ہیں خرج فلان من بلاد کذا۔ ودخل بلاد کذا۔ بلاد بلدہ کی جمع ہے۔ حالانکہ اس شخص کا داخلہ یا خروج کسی ایک خاص شہر سے ہوا کرتا ہے (تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۵۴ و ۱۵۵)

ان تاویلوں کے متعلق دریافت طلب یہ ہے کہ:۔ (۱) قرآن نے کب اور کہاں یہ دعوی کیا کہ مرج البحرین میں "بحرین" سے دریائے شور و دریائے شیریں مراد ہیں اور ان دونوں سے موتی پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) صدف میں مینہ کے قطرے سے موتی کا پیدا ہونا خلاف تحقیق ہے۔ (۳) آخری تاویل قرین قیاس ہے بشرطیکہ تاویل کا مبنیٰ ضعیف نہ ہو۔

سے محاورہ عرب میں بڑے موتیوں کو لؤلؤ اور چھوٹے کو مرجان کہتے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور قتادہ وضحاک کی روایتیں بھی اس کی تائید میں نقل کی ہیں۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۶۹)

اہلِ لغت میں صاحبِ لسان العرب کا خاص پایہ ہے مگر وہ بھی آگے نہیں بڑھتے [1]
اکیلے ایک ابن جریر طبری ہیں کہ آلاء کے معنی "قدرۃ" لکھتے ہیں۔

لیکن اس معرکۂ جدل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا آئیے اسی زبان اور اسی صدی کی زبان میں دیکھیں کہ اہلِ زبان اس کے کیا معنی سمجھتے تھے۔

کمیت اپنے گھوڑے کی صفت کرتا ہے۔

فرضیتُ "الآءَ" الکمیت فمن یدع   فرسا فلیس جوادنا بمباعٍ [2]

حماسی اپنے ممدوح ولید بن ادہم کے اقتدار کا مرثیہ خوان ہے:۔

اذا ما امرؤٌ اثنیٰ بآلاءِ میّتٍ   فلا یبعد اللّٰہ الولید بن ادھما

فضالہ فقر کی برائیاں گنتا ہے:۔

وفی الفقر ذلٌّ للرقاب وقلّما   رأیتُ فقیراً غیر نکسٍ مُذمَّمِ
یلام وان کان الصواب بکفّہ   وتُحمد "آلاءُ" البخیل المدرھمِ [3]

لطف یہ ہے کہ خود صاحب لسان العرب نے مادہ "نبہ" میں طرفہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

کاملٌ یَجمعُ "آلاءَ" الفتیٰ   نَبَہٌ سیدُ سادات خضمّ [4]

کلام میں تدبر کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں "الاء" کو قدرت و اقتدار کے معنے میں استعمال کرتے تھے جو نعمت و عذاب دونوں پر یکساں حاوی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اوصاف مراد لیتے تھے یہی معانی کلام عرب سے مترشح ہیں اور کلام اللہ میں ٹھیک اترتے ہیں۔

(۵)

---

[1] لسان العرب ج ۸ ص ۴۰۴ [2] کتاب الاقتضاب للبیدالطوسی ص ۵۴ [3] کتاب المعمرین ۵۸

[4] لسان العرب ج ۱۷ ص ۴۴۴

ایک بات کہنے سے رہ گئی، منشا غلط نابغہ کا یہ شعر تھا:-

ھم الملوک وابناء الملوک لھم　　فضلٌ علی الناس فی الآلاء والنعم

عجمی اہل لغت "نعم" پر "آلاء" کو قیاس کرکے دونوں کو مترادف سمجھے اور اس ترادف کو درست باور کرنے کے لئے پورا دیوان عجم بھرا پڑا تھا۔

فردوسی کہہ چکا ہے:-

بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سمجھے کہ انگبین و شہد ایک ہے تو "آلاء" اور "نعم" کیوں نہ ایک ہوں، اسلوب عرب سے اگر آگاہ ہوتے تو مترادفات کا خیال ہی نہ آتا جس سے ادب عرب کو سروکار ہی نہ تھا۔ جاہلیت کا کوئی دیوان دیکھئے، ایک بیت میں ایک معنے کے لئے دو لفظ کبھی نہ لائیں گے اگر کسی نے یہ غلطی کی تو ساقط الاعتبار ہوگیا؛ نابغہ کا مطلب صاف ہے کہ "آلاء" یعنے اقتدارات اور نعمات دونوں میں اس کے ممدوحین کی فضیلت مسلم ہے۔

حاشیہ۔ آلاء جمع ہے اور الی واحد، واحد کی صورت میں جب مکسور الاول لاتے ہیں تو اس سے عہد وپیمان مراد لیتے ہیں۔ اعشی کہتا ہے۔

ابیض لایرھب الھزال "ولا"　　یقطع رحماً ولا یخون "إلا"

جمع کی صورت میں جب آلاء کو غیر ممدود لاتے ہیں تو اس سے ایک درخت مراد لیتے ہیں جس کے پھل دیکھنے میں تو خوش مزہ مگر چکھنے میں بہت تلخ ہوتے ہیں بشر بن ابی خازم کہتا ہے۔

فانکم ومدحکم بجیراً　　ابا لجاءٍ کما امتدح "الالاء"

نعمت سے آلاء کی تاویل بھی خوش منظر ہے، لیکن اہل ذوق کو اندیشہ ہے آلاء کی طرح یہ بھی تلخ نہ ہو

مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو کہ سورۂ رحمان کی ابتدا جہان خدا کی رحمت سے ہوئی ہے کہ سابق ولاحق کی جلال وجبروت کی باتوں سے انسان مرعوب ہو کر از خود رفتہ نہ ہو جائے۔ وہیں ساتھ کے ساتھ ایسے واقعات بھی یاد دلائے ہیں جو قدرت خداوندی کے عظیم الشان نمونے ہیں اور جن وانس کو ان پر تنبیہ کیا ہے کہ وہ قادر مطلق جس کی قدرت اس قدر وسیع ہو اُس کے کون کون سے اقتدار سے مکر سکتے ہو۔ علامہ ابن جریر فرماتے ہیں۔

حدثنی یونس قال اخبرنا ابن وھب قال قال ابن زید فی قولہ "فبایّ آلاءِ ربکما تکذبان" قال "الآلاء" القدرۃ فبایّ آلائہ تکذب خلقکم کذا وکذا فبایّ قدرۃ اللہ تکذبان ایھا الثقلان الجن والانس[۱]	مجھ سے یونس نے روایت کی کہ ابن وہب نے انھیں اطلاع دی کہ "فبایّ آلاءِ ربکما تکذبان" کے متعلق ابن زید کہتے ہیں کہ "آلاء" کے معنے قدرت کے ہیں۔ یعنی خدا نے تمھیں اس طرح پیدا کیا۔ تم اے جماعت جن وانس خدا کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔[۱]

امام رازی خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ انسان کو جو نعمتیں خدا نے دی ہیں جب ان کا گنانا مقصود تھا تو "جن" کے پیدا کرنے میں کون سی نعمت ٹھیری۔ اس اعتراض کے تین جواب دئے ہیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں:۔

اِن الآیۃ مذکورۃ لبیان القدرۃ لا لبیان النعمۃ[۲]	یہ آیۃ نعمت کا تذکرہ کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ قدرت کا تذکرہ کرنے کے لئے ہے[۲]

ایک دوسرے مقام پر یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان (ان دو طرح کے دریاوں

[۱] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۶۵

[۲] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۳۔

ہیں سے بڑے چھوٹے موتی نکلتے ہیں، کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ای نعمة عظیمة فی اللؤلؤ و المرجان حتی یذکرهما الله تعالیٰ مع نعمة تعلم القرآن وخلق الانسان ؟	بڑے چھوٹے موتی ہیں کون ایسی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم اور انسان کی آفرینش کے ساتھ ہیں اس کا بھی تذکرہ کیا ؟

اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک وہ جس میں نعمتوں کی تقسیم کی ہے اور جس کو حرف (ز) کے تحت ہم نقل کر چکے ہیں۔ دوسری توجیہ حسب ذیل ہے :-

هذه بیان عجائب الله تعالیٰ لا بیان النعم[1]	یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کا بیان ہے۔ نعمتوں کا بیان نہیں ہے۔[1]

آلآء کو قدرت کا مماثل مان لینے کے بعد کسی تاویل کی حاجت نہیں رہتی۔ رحمت و نعمت وغیرہ ان سب کا مفہوم اسی قدرت کے تحت آجاتا ہے ؟

[1] تفسیر کبیر ص ۱۵ ۔

اسلامی قومیت

یہ مضمون اعلیٰ حضرت خسرو دکن نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہٗ کی سالگرہ مبارک کے موقع پر جریدہ "صبح دکن" کے سالگرہ نمبر کے لئے لکھا گیا تھا چونکہ آج کل اسلامی دنیا میں وطن، نسل اور زبان کی بنا پر نئی نئی قومیتیں قائم کرنے کی وبا پھیل رہی ہے اور اسلامی قومیت کے اصول مسلمانوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہو گئے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی ہدایت کے مطابق اسلام کے اصول قومیت، غیر اسلامی قومیتوں کے اصول سے الگ کر کے بتا دیے جائیں، جو لوگ حقیقت میں اسلام کے پیرو ہیں ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کافی ہے اور جو اپنے اہواء اور تخیلات کا اتباع کرتے ہیں، وہ آزاد ہیں کہ جن راہوں میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہ من نور۔ (اڈیٹر)

وحشت سے مدنیت کی طرف انسان کا پہلا قدم اٹھتے ہی ضروری ہو جاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کی ایک شان پیدا ہو اور مشترک اغراض و مصالح کے لئے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کریں تمدن کی ترقی کے ساتھ اس اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی مجموعہ افراد کا نام "قوم" ہے۔ اگرچہ لفظ "قوم" اور "قومیت" اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں حدیث العہد ہیں، مگر جس معنے پران کا اطلاق ہوتا ہے وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تمدن قدیم ہے، "قوم" اور "قومیت" جس ہیئت کا نام ہے، وہ بابل، مصر، روم اور یونان میں بھی ویسی ہی تھی جیسی آج فرانس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی میں ہے۔

قومیت کے غیر منفک لوازم اس میں شک نہیں کہ قومیت کی ابتدا ایک معصوم جذبہ سے ہوتی ہے یعنی اس کا مقصد اول یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لئے مل کر عمل کریں، اور اجتماعی ضروریات کے لئے ایک "قوم" بن جائیں، لیکن جب ان میں "قومیت" پیدا ہو جاتی ہے، تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ اس میں آجاتا ہے، اور جتنی جتنی "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب کبھی ایک قوم اپنے مفاد کی خدمت اور اپنے مصالح کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کرے گی یا بالفاظ دیگر اپنے گرد قومیت کا حصار کھینچ لے گی تو لازماً وہ اس حصار کے اندر اور باہر والوں کے درمیان اپنے اور غیر کا امتیاز کرے گی۔ اپنے کو ہر معاملہ میں غیر پر ترجیح دے گی۔ غیر کے مقابلہ میں اپنی کی حمایت کرے گی جب کبھی دونوں کے مفاد و مصالح میں اختلاف واقع ہوگا تو وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرے گی اور اس پر غیر کے مفاد کو قربان کردے گی۔ انہی وجوہ سے ان میں صلح بھی ہوگی اور جنگ بھی۔ مگر رزم اور بزم دونوں میں قومیت کی حد فاصل دونوں گروہوں کے درمیان قائم رہے گی۔ اسی چیز کا نام عصبیت وحمیت ہے۔ اور قومیت کی یہ وہ لازمی خصوصیت ہے جو اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

قومیت کے عناصر ترکیبی قومیت کا قیام، وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوت رابطہ وضابطہ ہونی چاہئے کہ اجسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمہ، ایک خیال، ایک مقصد، اور ایک عمل پر جمع کردے، قوم کے مختلف اور کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پیوستہ کردے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں، اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا غلبہ و تسلط حاصل کرلے کہ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحد ہوں اور ہر قربانی کے لئے آمادہ رہیں۔

یوں تو اشتراک اور وحدت کی جہتیں بہت سی ہونی ممکن ہیں، لیکن آغاز عہد تاریخ سے آج تک

دنیا میں جتنی قومیتیں بنی ہیں، ان سب کی تعمیر بجز ایک اسلامی قومیت کے، حسب ذیل اشتراکات میں سے کسی ایک قسم کے اشتراک پر ہوئی ہے۔ اور اس عنصر کے ساتھ چند دوسرے اشتراکات بھی بطور مددگار کے شریک ہو گئے ہیں:۔

اشتراکِ نسل جس کو "نسلیت" کہتے ہیں۔

اشتراک مرز و بوم جس کو "وطنیت" کہتے ہیں۔

اشتراک زبان جو وحدت خیال کا ایک زبردست ذریعہ ہونے کی وجہ سے قومیت کی تعمیر میں خاص حصہ لیتا ہے۔

اشتراکِ رنگ جو ایک رنگ کے لوگوں میں ہم جنسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پھر یہی احساس ترقی کر کے انکو دوسرے رنگ کے لوگوں سے احتراز واجتناب پر آمادہ کر دیتا ہے۔

معاشی اغراض کا اشتراک جو ایک معاشی نظام کے لوگوں کو دوسرے معاشی نظام والوں کے مقابلہ میں ممتاز کرتا ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنے معاشی حقوق ومنافع کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

نظام حکومت کا اشتراک۔ جو ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے، اور دوسری سلطنت کی رعایا کے مقابلے میں حدود فاصلہ قائم کر دیتا ہے۔

قدیم ترین عہد سے لیکر آج بیسویں صدی کے روشن زمانے تک جتنی قومیتوں کے عناصر اصلیہ کا آپ تجسس کریں گے۔ ان سب میں آپ کو یہی مذکورہ بالا عناصر ملیں گے۔

اب سے دو تین ہزار برس پہلے کی یونانیت، رومیت، اسرئیلیت، ایرانیت وغیرہ بھی انہی بنیادوں پر قائم تھیں جن پر آج کی المانیت، فرنساویت، انگریزیت، جاپانیت وغیرہ قائم ہیں

شر او رفساد کا سرچشمہ | یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بنیادیں جن پر دنیا کی مختلف قومیتیں تعمیر کی گئی ہیں،

انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ جماعتوں کی شیرازہ بندی کی ہے مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس قسم کی قومیتیں بنی نوع انسانی کے لئے ایک شدید مصیبت ہیں۔ انہوں نے عالم انسانی کو سینکڑوں ہزاروں حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور حصے بھی ایسے کہ ایک حصہ فنا کیا جا سکتا ہے۔ مٹا دیا جا سکتا ہے۔ مگر دوسرے حصے میں کسی طرح مبدل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نسل دوسری نسل میں نہیں بدل سکتی۔ ایک وطن دوسرا وطن نہیں بن سکتا۔ ایک زبان کے بولنے والے دوسری زبان کے بولنے والے نہیں بن سکتے ایک رنگ دوسرا رنگ نہیں بن سکتا ایک قوم کی معاشی اغراض بعینہ دوسری قوم کی معاشی اغراض نہیں بن سکتیں ایک سلطنت کبھی دوسری سلطنت نہیں بن سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قومیتیں ان بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں ان کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ قومی عصبیت کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، مزاحمت اور منافست کی ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پامال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپس میں لڑ لڑ کر فنا ہو جاتی ہیں اور پھر انہی بنیادوں پر دوسری قومیتیں ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دنیا میں فساد، بدامنی، اور شرارت کا ایک مستقل سرچشمہ ہے۔ خدا کی سب سے بڑی لعنت ہے شیطان کا سب سے زیادہ کامیاب حربہ ہے جس سے وہ اپنے ازلی دشمن انسان کا شکار کرتا ہے۔

عصبیت جاہلیہ اس قسم کی قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ انسان میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرے۔ وہ ایک قوم کو دوسری قوم سے مخالفت کرنے اور نفرت برتنے پر صرف اس لئے آمادہ کرتی ہے کہ وہ دوسری قوم کیوں ہے؟ اسے حق، صداقت، دیانت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ صرف یہ بات کہ ایک شخص کالا ہے۔ گورے کی نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے۔ صرف اتنی سی بات کہ ایک انسان ایشیائی ہے، فرنگی کی نفرتوں جابرانہ دراز دستیوں اور حق تلفیوں کو اس کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ آئن شائن جیسے فاضل کا اسرائیلی ہونا اس کے لئے کافی ہے کہ المانی اس سے نفرت کرے نشکیدی کا محض

ؔ بیچوانا لینڈ کے بامنگ واٹو قبیلہ کا سردار ہے جس کو حال میں ایک یوروپین پر سزائے تازیانہ جاری کرنے کے جرم میں (بقیہ صفحہ ۱)

سیاہ فام حبشی ہونا اس کو جائز کر دیتا ہے کہ ایک یورپین کو سزا دینے کے جرم میں اس کی ریاست چھین لی جائے، امریکہ کے مہذب باشندوں کے لئے یہ قطعاً جائز ہے کہ وہ حبشیوں کو پکڑ کر زندہ جلا دیں کیونکہ وہ حبشی ہیں۔ المانی کا المانی ہونا اور فرانسادی کا فرانسادی ہونا اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کریں اور دونوں کو ایک دوسرے کے محاسن یک سر معائب نظر آئیں۔ سرحد آزاد کے افغانیوں کا افغانی ہونا اور دمشق کے باشندوں کا عرب ہونا، انگریز اور فرانسیسی کو اس کا پورا حق بخش دیتا ہے کہ وہ ان کے سروں پر طیاروں سے گولے برسائیں اور ان کی آبادیوں کا قتل عام کریں خواہ یورپ کے مہذب شہریوں پر اس قسم کی گولہ باری کتنی ہی وحشیانہ حرکت سمجھی جاتی ہو۔ غرض یہ جنسی امتیاز وہ چیز ہے جو انسان کو حق اور انصاف کی طرف سے اندھا بنا دیتی ہے، اور اس کی وجہ سے عالمگیر اصول اخلاق و شرافت بھی قومیتوں کے قالب میں ڈھل کر کہیں ظلم اور کہیں عدل، کہیں سچ اور کہیں جھوٹ، کہیں کمینگی اور کہیں شرافت بن جاتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک نالائق بدکار، اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لئے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سپید اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ

بقیہ صفحہ ۴۲ - سلطنت برطانیہ نے حقوق ریاست سے محروم کر دیا تھا۔ حالانکہ دیسی باشندوں کے ساتھ اس کے افسوسناک برتاؤ کا خود برٹش ہائی کمشنر کو بھی اعتراف تھا۔ بعد میں غریب شکیدی کو صرف اس وقت بحال کیا گیا جبکہ اس نے ہمیشہ کے لئے یہ عہد کر لیا کہ وہ کبھی کسی ایسے مقدمہ کا فیصلہ نہ کرے گا جس کا کوئی تعلق کسی یورپین سے ہو۔ مگر ایسی کوئی شرط اس عہدنامہ میں نہ رکھی گئی کہ یورپین حضرات دیسی باشندوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہ فرمائیں گے۔

انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس چیز کے تصور کی گنجایش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت، اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دیگی۔ مگر نسلیت وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔

قومیت کے عناصر پر ایک عقلی تنقید تھوڑی دیر کے لئے اس پہلو سے قطع نظر کر لیجئے۔ یہ جتنے اشتراکات آج قومیت کی بنیاد بنے ہوئے ہیں ان کو خود ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھئے اور غور کیجئے کہ آیا یہ بجائے خود کوئی مضبوط عقلی بنیاد بھی رکھتے ہیں یا انکی حقیقت محض ایک سراب تخیل ہے۔

نسلیت نسلیت کیا ہے؟ محض خون کا اشتراک۔ اس کا نقطۂ آغاز ماں اور باپ کا نطفہ ہے جس سے چند انسانوں میں خونی رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی نقطہ پھیل کر خاندان بنتا ہے، پھر قبیلہ، پھر نسل۔ اس آخری حد یعنے نسل تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے اس باپ سے جس کو اس نے اپنی نسل کا مورث اعلیٰ قرار دیا ہے، اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی مورثیت محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ نام نہاد "نسل" کے اس دریا میں بیرونی خون کے بہت سے ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اور کوئی صاحب عقل و علم انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ دریا خالص اسی پانی کا ہے جو اپنے اصلی سرچشمہ سے نکلا تھا۔ پھر اگر اس خلط ملط کے باوجود خون کے اشتراک کی بنا پر انسان ایک "نسل" کو اپنے لئے مادۂ اتحاد قرار دے سکتا ہے۔ تو کیوں نہ اس خون کے اشتراک کو بناء وحدت قرار دیا جائے جو تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملا ہے؟ اور کیوں نہ تمام انسانوں کو ایک ہی نسل اور ایک ہی اصل کی طرف منسوب کیا جائے؟ آج جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی و مورث قرار دے لیا گیا ہے ان سب کا نسب اوپر جا کر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتا ہے، اور آخر میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں۔ پھر یہ آریت اور سامیت کی تقسیم کیسی ہے؟

وطنیت مرز و بوم کے اشتراک کی حقیقت اس سے بھی زیادہ موہوم ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ یقیناً ایک گز مربع سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس رقبہ کو اگر وہ اپنا وطن قرار دے تو شائد وہ کسی کو اپنا ہم وطن نہیں کہہ سکتا۔ لیکن وہ اس چھوٹے سے رقبہ کے ارد گرد میلوں اور کوسوں تک، اور بسا اوقات سینکڑوں اور ہزاروں میل تک ایک سرحدی خط کھینچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہاں تک میرا وطن ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اس کی نظر کی تنگی ہے۔ ورنہ کوئی چیز اسے تمام روئے زمین کو اپنا وطن کہنے سے مانع نہیں ہے۔ جس دلیل کی بنا پر ایک مربع گز کا وطن پھیل کر ہزار مربع گز بن سکتا ہے، اسی دلیل کی بنا پر وہ پھیل کر پورا کرۂ ارضی بھی بن سکتا ہے اگر آدمی اپنے زاویہ نظر کو تنگ نہ کرے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جن کو اس نے محض اپنے خیال میں حدود فاصل قرار دے کر ایک زمین اور دوسری زمین میں فرق کیا ہے سب کے سب ایک ہی زمین کے اجزا ہیں۔ پھر کس بنا پر اس نے ان دریاؤں اور پہاڑوں اور سمندروں کو یہ حق دیدیا کہ وہ اسے ایک خاص خطہ میں قید کر دیں؟ وہ کیوں نہیں کہتا کہ میں زمین کا باشندہ ہوں۔ سارا کرۂ ارضی میرا وطن ہے، جتنے انسان ربع مسکون میں آباد ہیں، میرے ہم وطن ہیں، اس پورے سیارے پر میں وہی پیدائشی حقوق رکھتا ہوں جو اس گز بھر زمین پر مجھے حاصل ہیں جہاں میں پیدا ہوا ہوں؟۔

لسانی امتیاز اشتراک زبان کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں وہ باہمی تفاہم اور تبادلۂ خیالات کے زیادہ مواقع رکھتے ہیں۔ اس سے اجنبیت کا پردہ بڑی حد تک اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے قریب تر محسوس کرتے ہیں۔ مگر ادائے خیال کے وسیلہ کا مشترک ہونا، خود خیال کے اشتراک کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک ہی خیال دس مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور ان سب کے بولنے والوں کا اس خیال میں متحد ہو جانا ممکن ہے۔ بخلاف اس کے

دس مختلف خیالات ایک زبان میں ادا ہوسکتے ہیں۔ اور کچھ بعید نہیں کہ اس زبان کے بولنے والے ان خیالات کے معتقد ہو کر باہم مختلف ہو جائیں۔ لہٰذا وحدت خیال جو حقیقۃً قومیت کی جان ہے اشتراک زبان کا محتاج نہیں ہے۔ اور نہ اشتراک زبان کے ساتھ وحدتِ خیال ضروری ہے۔ پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ آدمی کی آدمیت، اور اس کے ذاتی حسن و قبح میں اس کی زبان کو کیا دخل ہے؟ ایک جرمن بولنے والے شخص کو ایک فرنچ بولنے والے کے مقابلہ میں محض اس بنا پر کیسے ترجیح دی جاسکتی ہے کہ وہ جرمن زبان بولتا ہے؟ دیکھنے کی چیز اس کا جوہر ذاتی ہے نہ کہ اس کی زبان۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک ملک کے انتظامی معاملات اور عام کاروبار میں وہی شخص مفید ہوسکتا ہے۔ جو اس ملک کی زبان جانتا ہو۔ اگر انسانیت کی تقسیم اور قومی امتیاز کے لئے یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔

امتیاز رنگ انسانی جماعتوں میں رنگ کا امتیاز سب سے زیادہ لغو و مہمل چیز ہے۔ رنگ محض جسم کی ایک صفت ہے مگر انسان کو انسان ہونے کا شرف اس کے جسم کی بنا پر نہیں، اس کی روح اس کے نفس ناطقہ کی بنا پر ہے جس کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ پھر انسان اور انسان میں زردی اور سرخی، سیاہی اور سپیدی کا امتیاز کیسا؟ ہم کالی گائے اور سپید گائے کے دودھ میں کوئی فرق نہیں کرتے اس لئے کہ مقصود اس کا دودھ ہے نہ کہ اس کا رنگ لیکن عقل کی بے راہ روی کا بُرا ہو کہ اس نے ہم کو انسان کی نفسی صفات سے قطع نظر کر کے اس کی جلد کے رنگ کی طرف متوجہ کر دیا۔

معاشی قومیت معاشی اغراض کا اشتراک انسانی خودغرضی کا ایک ناجائز بچہ ہے۔ قدرت نے اس کو ہرگز پیدا نہیں کیا۔ آدمی کا بچہ کام کرنے کی قوتیں ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جدوجہد کے لئے اس کو ایک وسیع میدان ملتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے بے شمار وسائل اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مگر وہ اپنی معیشت کے لئے صرف اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے رزق کے دروازے

کھلیں بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسروں کے لئے وہ بند ہوجائیں۔ اسی خودغرضی میں انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے مشترک ہوجانے سے وہ وحدت پیدا ہوجاتی ہے جو انہیں ایک قوم بننے میں مدد دیتی ہے۔ بظاہر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معاشی اغراض کا ایک حلقہ قائم کرکے اپنے حقوق و مفاد کا تحفظ کرلیا۔ لیکن جب اسی طرح بہت سی جماعتیں اپنے گرد اس قسم کے حصار کھینچ لیتی ہیں تو انسان پر اس کے اپنے ہاتھوں سے عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ اس کی اپنی خودغرضی اس کے پاؤں میں بیڑی اور ہاتھ میں ہتھکڑی بن جاتی ہے۔ اور وہ دوسروں کے لئے رزق کے دروازے بند کرنے کی کوشش میں خود اپنے رزق کے دروازوں کی کنجیاں گم کردیتا ہے۔ آج ہماری آنکھوں کے سامنے یہ منظر موجود ہے کہ یورپ امریکہ اور جاپان کی سلطنتیں اس خودغرضی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان معاشی قلعوں کو کس طرح مسمار کریں جن کو انہوں نے خود ہی حفاظت کا بہترین وسیلہ سمجھ کر تعمیر کیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم یہ نہ سمجھیں گے کہ کسب معیشت کے لئے حلقوں کی تقسیم اور ان کی بنا پر قومی امتیازات کا قیام ایک غیر عاقلانہ فعل ہے؟ خدا کی وسیع زمین پر انسان کو اپنے رب کا فضل تلاش کرنے کی آزادی دینے میں آخر کونسی قباحت ہے؟

سیاسی قومیت | نظام حکومت کا اشتراک بجائے خود ایک ناپائیدار اور ضعیف البنیان چیز ہے، اور اس کی بنا پر ہرگز کسی مستحکم قومیت کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ ایک سلطنت کی رعایا کو اس کی وفاداری کے رشتہ میں منسلک کرکے ایک قوم بنا دینے کا خیال کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ سلطنت جبتک غالب و قاہر رہتی ہے۔ رعایا اس کے قانون کی گرفت میں بندھی رہتی ہے۔ یہ گرفت جہاں ڈھیلی ہوئی اور مختلف عناصر منتشر ہوگئے۔ سلطنت مغلیہ میں مرکزی طاقت کے کمزور ہونے کے بعد کوئی چیز ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنی الگ الگ سیاسی قومیتیں بنا لینے سے نہ روک سکی۔ یہی حشر سلطنت عثمانیہ کا ہوا۔ آخر زمانہ میں جوان ترک نے عثمانی قومیت کا قصر تعمیر کرنے کے لئے بہت کچھ زور لگایا۔ مگر ایک ٹھیس لگتے ہی سب اینٹ پتھر جدا ہوگئے۔ تازہ ترین مثال آسٹریا ہنگری کی ہے۔ اور تاریخ سے بہت سی مثالیں اور بھی پیش

کی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد جو لوگ سیاسی قومیتوں کی تعمیر ممکن سمجھتے ہیں۔ وہ محض اپنے تخیل کی شادابی کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

انسانیت و آفاقیت اس تنقید سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نسل انسانی میں یہ جتنی تفریقیں کی گئی ہیں ان کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ یہ صرف حسی اور مادی تفریقیں ہیں جن کا ہر دائرہ زاویۂ نظر کی ہر وسعت پر ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا قیام و بقا جہالت کی تاریکی، نگاہ کی محدودیت، اور دل کی تنگی پر منحصر ہے۔ علم و عرفان کی روشنی جس قدر پھیلتی ہے، بصیرت کی رسائی جس قدر بڑھتی ہے، قلب میں جتنی جتنی وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ مادی اور حسی پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ نسلیت کو انسانیت کے لئے اور وطنیت کو آفاقیت کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔ اختلاف رنگ و زبان میں جوہر انسانی کی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کی زمین میں خدا کے سب بندوں کی معاشی اغراض مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور سیاسی نظامات کے دائرے محض چند سائے نظر آتے ہیں جو آفتاب اقبال کی گردش سے روئے زمین پر چلتے پھرتے، گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔

اسلام کا وسیع نظریہ ٹھیک یہی بات ہے جو اسلام کہتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی تفریق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں:۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (۴ : ۱)۔

خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو (دنیا میں) پھیلا دیا۔

تمہارے درمیان مرز و بوم اور مولد و مدفن کا اختلاف کوئی جوہری چیز نہیں ہے اصل میں تم سب ایک ہی ہو۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ

اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ (۶: ۱۲) — ہر ایک کا ایک ٹھکانا ہے اور ایک جگہ اس کے سپرد خاک ہونے کے لئے ہے۔

اس کے بعد نسل اور خاندان کے اختلاف کی بھی یہ حقیقت بتا دی کہ:—

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹: ۲) — اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

یعنی یہ شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف کے لئے ہے، آپس کے بغض ایک دوسرے پر تفاخر، ایک دوسرے سے جھگڑنے کے لئے نہیں ہے۔ اس اختلاف میں انسانی اصل کی وحدت کو نہ بھول جاؤ۔ تم میں اگر کوئی حقیقی تفریق ہے تو وہ صدق اور کذب، نیکی اور بدی کی بنا پر ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ گروہوں کی تفریق اور جماعتوں کا اختلاف خدا کا عذاب ہے جو تم کو آپس کی دشمنی کا مزا چکھاتا ہے۔

أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (۶: ۸) — یا تم کو گروہ گروہ بنا دے اور تمہیں ایک دوسرے کی قوت کا مزا چکھائے۔

اس گروہ بندی کو اس نے من جملہ اُن جرائم کے قرار دیا ہے جن کی بنا پر فرعون لعنت و عذاب کا مستحق ہوا:—

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا (۲۸: ۱) — فرعون نے زمین میں تکبر کیا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا [1]

[1] یہ آیت اس تاریخی جرم کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون نے مصر کے باشندوں میں قبطی اور غیر قبطی کی تفریق قائم کی اور دونوں کے ساتھ مختلف طرز عمل اختیار کیا۔

پھر کہا کہ زمین خدا کی ہے، اس نے نوع انسانی کو اس میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا ہے، اس کی سب چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے، کچھ ضرور نہیں کہ انسان ایک خطہ کا بندہ بن کر رہ جائے یہ وسیع زمین اس کے لئے کھلی ہوی ہے۔ ایک جگہ اس کے لئے تنگ ہو تو دوسری جگہ چلا جائے، جہاں جائیگا، خدا کی نعمتیں موجود پائے گا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲:۴) (آدم کی تخلیق کے وقت خدا نے فرمایا کہ) میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ (۲۲:۹)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے تمہارے لئے ان سب چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو زمین میں ہیں۔

اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا (۴:۴،) کیا اللہ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے۔

وَمَنْ یُّھَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرَاغَمًا کَثِیْرًا وَّ سَعَۃً (۴:۴) جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں وافر جگہ اور کشایش پائے گا۔

آپ پورے قرآن کو دیکھ جائیے۔ اس میں ایک لفظ بھی آپ کو نسلیت یا وطنیت کی تائید میں نہ ملے گا۔ اس کی دعوت کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے، تمام روے زمین کی انسانی مخلوق کو وہ خیر و صلاح کی طرف بلاتا ہے۔ اس میں نہ کسی قوم کی تخصیص ہے اور نہ کسی سرزمین کی۔ اس نے اگر کسی زمین کے ساتھ خاص تعلق پیدا کیا ہے تو وہ صرف حرم مکہ کی زمین ہے۔

..... لیکن اس کے متعلق بھی صاف کہدیا کہ سَوَاءَ ا لْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ (۲۲:۳) یعنی مکہ کے اصلی باشندے اور باہر کے آنے والے سب وہاں برابر ہیں[1]۔ اور جو مشرکین وہاں کے اصلی

---

[1] اسی وجہ سے فقہاے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے مکہ کی سرزمین پر کسی کے حق ملکیت کو تسلیم نہیں کیا۔ بقیہ برصفحہ ۴۹

باشندے تھے ان کے متعلق کہا کہ وہ نجس ہیں۔ ان کو وہاں سے نکال باہر کرو۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا (۹:۴) اس تصریح کے بعد اسلام میں وطنیت کا کلی استیصال ہوجاتا ہے۔ اقبال نے بالکل سچ کہا ہے :-

پاک ہے گرد وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

اور در حقیقت مسلمان ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ :-

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ماست

عصبیت اور اسلام کی دشمنی اسلام جب ظاہر ہوا تو اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی نسل و وطن کے تعصبات و امتیازات تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم ان تعصبات میں سب سے پیش پیش تھی۔ خاندانوں کے مفاخر اور نسبی و ذاتی وجاہتوں کے تخیلات ان کو صداقت اسلام پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن اگر خدا کی طرف سے اترتا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اترتا۔ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۴۳ : ۳۱) ابوجہل سمجھتا تھا کہ محمد (صلعم) رسالت کا دعوی کرکے اپنے خاندانی مفاخر میں ایک اور فخر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا قول تھا کہ "ہم سے اور بنو عبد مناف سے مقابلہ تھا۔ ہم شہ سواری میں ان کے حریف تھے کھانے اور کھلانے میں، عطار اور بخشش میں انکے برابر تھے اب وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وحی آنی شروع ہوئی ہے، خدا کی قسم ہم تو کبھی محمدؐ کی تصدیق نہ کریں گے"

بقیہ حاشیہ بصفحہ ۴۸۔ حضرت عمر اہل مکہ کو گھروں کے دروازے بند کرنے سے روکتے تھے تاکہ حجاج و زائرین جہاں چاہیں اتریں حضرت عمر ابن عبدالعزیز مکہ میں مکانات کے کرایہ لینے سے منع کرتے تھے اور انہوں نے امیر مکہ کو فرمان لکھا تھا کہ لوگوں کو اس سے روکیں بعض فقہا نے کہا ہے کہ جس نے اپنے خرچ سے وہاں مکان بنایا وہ اس کا کرایہ لے سکتا ہے مگر میدان اور خرابات اور مکانوں کے صحن پر سب کا حق ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مکہ حرام لا یحل بیع رباعھا ولا اجور بیوتھا۔ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوا۔ انما ھی مناخ من سبق۔ یہ اس زمین کا حال ہے جس سے اسلام نے خصوصیت پیدا کی۔

یہ صرف ابوجہل ہی کے خیالات نہ تھے بلکہ تمام مشرکین قریش کے نزدیک رسول اللہ کے پیش کردہ دین کا یہی عیب تھا کہ :-

مذہب او قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضل عرب

در نگاہ او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خوان نشست

قدر احرار عرب نشناختہ — با کلفتان حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند — آبروے دودمانے ریختند

اسی بنا پر قریش کے تمام خاندان بنی ہاشم سے بگڑ گئے۔ اور بنی ہاشم نے بھی تو قومی عصبیت کی خاطر رسول اللہ کی حمایت کی حالانکہ ان میں سے اکثر مسلمان نہ تھے شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کو اسی لئے محصور کیا گیا، اور تمام قریش نے اسی وجہ سے ان سے مقاطعہ کر لیا۔ جن مسلمانوں کے خاندان کمزور تھے ان کو شدید مظالم سے تنگ آکر حبش کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور جن کے خاندان طاقتور تھے وہ اپنی حق پرستی کی بنا پر نہیں بلکہ خاندانی طاقت کی بنا پر قریش کے ظلم و ستم سے ایک حد تک محفوظ رہے۔

عرب کے یہودی انبیائے بنی اسرائیل کی پیش گوئیوں کی بنا پر مدتوں سے ایک نبی کے منتظر تھے۔ انہی کی دی ہوئی خبروں کا نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت شائع ہوئی تو مدینہ کے بہت سے باشندے مسلمان ہو گئے۔ مگر یہودیوں کو اس چیز نے آپ کی تصدیق سے روک دیا کہ آنے والا نبی، بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آیا؟ حتیٰ کہ اس تعصب نے ان کو یہاں تک مدہوش کیا کہ وہ موحدین کو چھوڑ کر بت پرستوں کے ساتھی ہو گئے۔ یہی حال نصاریٰ کا تھا۔ آنے والے نبی کے وہ بھی منتظر تھے۔ مگر ان کو توقع تھی کہ وہ شام میں پیدا ہو گا۔ عرب کے کسی نبی کو ماننے کے لئے وہ طیار نہ تھے۔ ہرقل کے پاس جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان پہنچا تو اس نے قریش کے تاجروں

نے کہا کہ "مجھے معلوم تھا کہ نبی آنے والا ہے۔ مگر یہ امید نہ تھی کہ وہ تم میں سے ہوگا۔" مقوقس کے پاس جب دعوت نامہ اسلام پہنچا تو اس نے بھی یہی کہا کہ "ابھی ایک نبی آنا باقی ہے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ مگر مجھے امید تھی کہ وہ شام میں آئے گا۔" اسی تعصب کا دور دورہ عجم میں بھی تھا۔ خسرو پرویز کے پاس جب حضور کا نامہ مبارک پہنچا تو کس چیز نے اس کو غضب ناک کیا؟ یہی کہ "ایک غلام قوم کا فرد اور بادشاہ عجم کو اس طرح خطاب کرے"! وہ عرب کی قوم کو ذلیل سمجھتا تھا۔ اپنا ماتحت خیال کرتا تھا۔ یہ بات ماننے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھا کہ ایسی قوم میں کوئی حق کی طرف بلانے والا پیدا ہوگا۔

اسلام کے خلاف اس کے دشمن یہودیوں کے پاس سب سے بڑا کارگر حربہ یہی تھا کہ مسلمانوں میں قبائلی عصبیت پیدا کریں۔ اسی بنیاد پر مدینہ کے منافقین سے ان کا سازباز تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ کر انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) میں عصبیت کی ایسی آگ بھڑکائی کہ تلواریں کھنچنے کی نوبت آ گئی۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یَآ اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یَرُدُّوۡکُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ (۳:) یہی نسل ووطن کا تعصب تھا جس نے مدینہ میں قریش کے نبی کو حکمران دیکھ کر، اور مہاجرین کو انصار کے باغوں اور نخلستانوں میں چلتے پھرتے دیکھ کر، مدینے کے منافقین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن اُبی رأس المنافقین کہا کرتا تھا کہ "یہ قریش کے فقیر ہمارے ملک میں آ کر پھل پھول گئے ہیں۔ ان کی مثل ایسی ہے کہ کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے" وہ انصار سے کہتا تھا کہ "تم لے اٹھو اپنے سر چڑھایا ہے، اپنے ملک میں جگہ دی۔ اپنے اموال میں ان کو حصہ دیا۔ خدا کی قسم آج تم ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔" اس کی ان باتوں کا جواب قرآن مجید میں اس طرح دیا گیا ہے:۔

هُمُ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰی مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنۡفَضُّوۡا — یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھ والوں پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ یہ تتر بتر ہو جائیں حالانکہ

لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ	آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا اصلی مالک اللہ ہے
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ	مگر منافقین اس بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ
رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا	اگر ہم (جنگ سے) مدینہ کی طرف واپس ہوئے تو جو
الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ	عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ	دیگا۔ حالانکہ عزت دراصل اللہ اور اسکے رسول اور
(۶۳ : ۱)	مومنوں کی ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں جانتے

یہی عصبیت کا جوش تھا جس نے عبداللہ بن اُبَیّ سے حضرت عائشہ پر تہمت لگوائی اور خزرج والوں کی حمایت نے اس دشمن خدا و رسول کو اپنے کئے کی سزا پانے سے بچا لیا۔　　(باقی)

آئینِ محبت

اے خدا! تیری رضیات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اگر ہم اب تیری مرضی پر چلنا چاہتے ہیں۔ اور تجھکو راضی رکھنا چاہتے ہیں تو قرآن کے علم و عمل کے سوا سب ہوا و ہوس ہے۔

الٰہی تیرے ملنے کا راستہ بتانے کے لئے قرآن ہی نور و ہدایت ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے تاریکی اور گمراہی ہے۔

مالک مجھے تجھ سے ازلی محبت ہے۔ اس لئے تو نے قرآن پاک کو "آئین محبت" کی شکل میں بھیجا ہے۔ اور تو دیکھ رہا ہے کہ ہم اس کو سینے سے لگائے ہوئے تیری طرف دوڑ رہے ہیں یا نہیں۔

ابو محمد مصلحؒ

کلام القرآن

از

مولانا الحاج ابو الخیر محمد خیر اللہ صاحب سنوسی القادری (ورنگل)

قرآن کریم کو ہر نوع مسلمانوں کے دلوں میں اتار دینا جب ہمارا مقصود ہے تو اپنے اردو لٹریچر سے بھی اس سلسلہ میں کام لینا ضروری ہے لٹریچر کو دل و دماغ کی تربیت اور جذبات کی آفرینش میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ آج اردو تحریرات اور بول چال میں کتنے انگریزی الفاظ ہیں جو دخیل ہو کر اپنی قوت نفوذ سے نہ صرف انگریزی داں بلکہ عام جہلا کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں ان جاہل زبانوں سے انکا استعمال یہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھ کر ہی موزوں و مناسب مواقع پر ان کو برت رہے ہیں حالانکہ انگریزی کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی۔ غرض کہ زبان کے الفاظ کا زبان زد عوام ہو جانا بھی ناواقفوں کو اس کے معنی و مطلب سے خواہ مخواہ واقف بنا دیتا ہے

اس لحاظ سے میری رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض مرکب الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کو ہم اردو میں استعمال کرنا شروع کر دیں اور روزمرہ کی موزونیت و مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے فقرے کلام پاک سے چن کر "ترجمان القرآن" میں شائع کرتے رہیں۔ اس طریقہ کو سلف نے بھی اپنی فارسی تحریرات و تصنیفات میں ملحوظ رکھا ہے۔ آج بھی کلام پاک کے بعض فقرے جو اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں یہ انھیں کا فیضان ہے۔

مولانا ابوالکلام نے بھی الہلال و البلاغ میں اس موزوں مقصد اشاعت قرآن کو نہایت تزک و احتشام و شاندار اہتمام کے ساتھ جاری رکھا تھا جس سے اردو کا اثر و نفوذ بھی اپنے دم خم

دکھانے لگا اور شوکت کلام نے مولانا کو سارے ہندوستان میں فی الواقع اسم با مسمیٰ تسلیم کرادیا۔ غرض ہماری اس سعی عمل سے قرآن اور اردو دونوں کی خدمت ہوجائے گی اسی فکر و تردد میں خیال کا اس طرف منتقل ہوجانا تھا کہ آج صبح کی تلاوت میں مینے مختلف مقامات سے بعض ایسے الفاظ اور فقروں کو منتخب کرلیا ہے اور ناظرین "ترجمان القرآن" کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس ذوق سخن سے وہ لوگ بہت زیادہ محظوظ ہوں گے جنہوں نے اہل حرمین شریفین کو اپنی گفتگو و محاورہ میں اس طرح سے قرآن پاک کو استعمال کرتے دیکھا اور سنا ہے۔

بازار مکہ میں ایک عرب سائل نے کچھ مانگا۔ اس کو جو کچھ اس وقت دیا جا سکتا تھا دیا گیا۔ مگر اس نے کچھ زیادہ حاصل کرنا چاہا اور کہا أَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ یعنی جیب (گریبان نہیں کیسہ) میں ہاتھ ڈالو تو سفید سفید (روپے) نکل آئیں گے۔ میں نے بھی قرآن حکیم ہی سے فوراً جو اس وقت یاد آگیا یہ جواب دیا۔ خُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۔ جو کچھ دیا گیا ہے لے لو اور خدا کا شکر ادا کرو۔ اس سے وہ بہت محظوظ ہو کر میرا پتہ پوچھتا ہوا روانہ ہوگیا۔ (یہ دونوں فقرے موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہیں)۔ ایک روایت جناب رابعہ بصریہ رح کے کلام القرآن کی نسبت بھی اسی طرح مشہور ہے۔

۱۔ أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّىٰ	کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے۔
۲۔ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ	یہ لوگ تو بس گمان پر چلتے ہیں۔
۳۔ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ	وہ تو نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔
۴۔ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ	کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو۔
۵۔ مَا لَكُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ	تم کو کچھ اس کا علم نہیں ہے۔
۶۔ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ	اس کو اپنے برے کام اچھے معلوم ہونے لگے ہیں۔

۷- یَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ	جانوروں کی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔
۸- تَعْسًا لَّهُمْ	اِن کا بُرا ہو (ان کا ستیاناس ہو)
۹- مَاذَا قَالَ اٰنِفًا	اس نے ابھی ابھی کیا کہا۔
۱۰- اٰتِنَا غَدَاءَنَا	ہمارا ناشتہ لاؤ
۱۱- ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ	ارے یہی تو ہم چاہتے ہیں۔
۱۲- لَا رَيْبَ فِيْهِ	اس میں کوئی شک نہیں ہے۔
۱۳- شَيْءٌ عُجَابٌ	بڑی عجیب بات ہے
۱۴- شَيْءٌ يُّرَادُ	غرض و مطلب کی بات ہے
۱۵- اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ	یہ تو ان کی من گھڑت ہے۔
۱۶- عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ	مجھکو اس نے باتوں میں دبا لیا۔
۱۷- حَسْبِيَ اللّٰهُ	میرے لئے خدا کافی ہے۔
۱۸- تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	میں نے خدا پر بھروسہ کر لیا ہے۔
۱۹- فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ	وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہ گیا۔
۲۰- تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ	تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔
۲۱ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ	تم ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لوگے۔
۲۲- لَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمَاهُمْ	ان کو تو تم ان کی صورت ہی سے پہچان جاؤگے۔
۲۳- اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ	کیا خدا اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟
۲۴- اُفَوِّضُ اَمْرِيْ اِلَى اللّٰهِ	میں اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
۲۵ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ	صبح اور شام۔

مذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۴)

مذہب جبر دوسری طرف جبریہ ہیں جو کہتے ہیں کہ وجود میں کوئی چیز اللہ کے ارادے کے بغیر داخل نہیں ہوتی۔ عام اس سے کہ وہ اشیار کی ذوات ہوں یا ان کی صفات۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ کائنات میں ہر ہر ذرہ کی حرکت اللہ کی قضار و قدر کے تحت واقع ہوتی ہے، وجود اور ایجاد میں اللہ کے سوا کوئی چیز تاثیر نہیں رکھتی۔ خلق اور ابداع میں اللہ کے ساتھ کوئی چیز شریک نہیں ہے۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ کوئی شئے اس کے حکم اور اس کی قضا کے خلاف بال برابر حرکت نہیں کر سکتی۔ اس کے افعال پر حسن یا قبح کا حکم لگانا عقل کے امکان میں نہیں ہے۔ اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں ہم جن حوادث کے صدور کو اسباب کے تحت مشاہدہ کرتے ہیں، وہ محض ظاہر کے لحاظ سے ایسے ہیں۔ ورنہ حقیقتاً سب کا صدور اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے، اور تمام ارضی و سماوی حوادث کا فاعل حقیقی وہی ہے۔

اِس اصل سے متعدد فرعی اعتقادات نکلے ہیں جہم بن صفوان اور شیبان بن سلمہ خارجی کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے۔ نہ وہ ارادہ رکھتا ہے۔ اور نہ اختیار، اللہ تعالیٰ جس طرح جمادات، نباتات اور دوسری چیزوں میں افعال پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان میں بھی پیدا کرتا ہے انسان کی طرف ان کی نسبت محض مجازی ہے۔ رہا ثواب و عقاب تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح وہ بھی جبری ہے۔ یعنی جس طرح جبر کی بنا پر انسان اچھے اور بُرے افعال کرتا ہے اسی طرح جبر ہی

کی بنا پر اسے جزا اور سزا بھی دی جاتی ہے ۔ یہ خالص جبریت ہے جو معتزلہ کی خالص قدریت کے مقابلہ میں ہے ۔

ایک دوسری جماعت جس میں حسین النجار، بشر بن غیاث المریسی، ضرار بن عمرو، حفص الفرد، ابو عبداللہ محمد بن کرام، شعیب بن محمد الخارجی اور عبداللہ بن اباض صاحب اباضیہ وغیرہ شامل ہیں خدا کو انسان کے تمام اچھے اور برے اعمال کا خالق تو قرار دیتی ہے، مگر اس کی رائے میں بندوں کو ایک قدرت و ارادۂ حادثہ بھی حاصل ہے جو ان افعال میں ایک طرح کی تاثیر رکھتی ہے ۔ اس کا نام انہوں نے "کسب" رکھا ہے ۔ اور یہی کسب، ثواب و عقاب کے مقابل اور اوامر و نواہی کی تکلیف کا مورد ہے ۔

امام ابو الحسن اشعری نے انسان کے "کسب" کو تسلیم کیا اور اس کے لئے قدرت حادثہ بھی ثابت کی مگر اس قدرت کی تاثیر سے انکار کر دیا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ اپنے بندے سے جس فعل کے صدور کا ارادہ کرتا ہے، وہ بندہ کی قدرتِ حادثہ کے تحت صادر ہو جاتا ہے لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادۂ الٰہی کے فعل میں آنے کا ۔ ورنہ حقیقۃً خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں ہے جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو۔

قاضی ابو بکر باقلانی نے اس سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے ۔ ان کی رائے میں انسان کے ہر فعل کی دو جہتیں ہیں ۔ ایک جہت اس کے نفس فعل ہونے کی ہے بلا اعتبار حسن و قبح وخیر و شر ۔ اور دوسری جہت اس کے طاعت اور معصیت ہونے کی ہے ۔ مثلاً نماز اور روزہ ۔ کہ اس میں ایک جہت تو یہ ہے کہ وہ نفس قیام اور قعود اور ترک غذا اور ترک مباشرت ہے ۔ اور دوسری جہت یہ ہے کہ وہ عبادت اور طاعت ہے ۔ ان میں سے پہلی جہت باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے ۔ اور دوسری جہت بندہ کی طرف یہی دوسری جہت ہے جو فعل کے ساتھ قدرت حادثہ کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے ۔ اور ان میں یقیناً بندے کی قدرت تاثیر رکھتی ہے

اور اسی پر جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔

استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی نے اس مسلک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک ذاتِ فعل اور اس کی صفات (یعنی حسن و قبح) دونوں معاً، بندے اور خدا دونوں کی قدرت کے تحت حاصل ہوتے ہیں۔

امام الحرمین نے ان تینوں کے مذہب کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے میں قدرت اور ارادہ پیدا کیا ہے۔ پھر اسی قدرت اور ارادہ سے بندے کے مقدورات اور مرادات حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں امام رازی آتے ہیں جو مذہب جبر کے پر زور وکیل ہیں۔ وہ بندہ کی قدرت کے لئے کسی قسم کی تاثیر تسلیم نہیں کرتے "کسب" کو ایک اسم بلا مسمیٰ سمجھتے ہیں۔ خدا کو بندوں کے تمام اعمال کا خالق قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کفر اور ایمان، طاعت اور معصیت، ہدایت اور ضلالت، سب کچھ خدا ہی اپنے بندوں میں پیدا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی سے کفر کے صدور کا ارادہ کرے اور وہ مومن ہو جائے۔ خدا کے علم میں کوئی شخص مومن ہو اور وہ کافر ہو جائے۔ خدا نے کسی میں طاعت پیدا کی ہو اور وہ اس کے خلاف عاصی ہو جائے۔ رہا یہ سوال کہ جب ان سب چیزوں کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اور بندوں میں اس کے خلاف چلنے کی طاقت نہیں ہے تو پھر اوامر و نواہی کی تکلیف کیونکر جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ خدا کے لئے تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔ اور اس کے کاموں میں کیوں اور کس لئے کا سوال نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اشاعرہ اور ان کے ہم خیال حضرات، خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں، اور قدرتِ حادثہ کے لئے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ان کے احتجاج کا منطقی نتیجہ خالص جبر ہی ہے

کیونکہ جب خدا اپنے بندوں کا خالق ہے اور اسی نے ان کے اچھے اور برے اعمال کے صدور کا ارادہ کیا ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہوگی۔ یا تو بندہ میں قضاء الٰہی کے خلاف عمل کرنے کی قوت ہوگی یا نہ ہوگی۔ صورتِ اول بندے کی قدرت اور اس کے ارادہ کا خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ پر غالب آجانا لازم آتا ہے جو بالاتفاق باطل ہے۔ بصورتِ دوم خدا کی قدرت کے آگے بندے کی قدرت کا بے اثر اور خدا کے ارادہ کے سامنے بندے کے ارادہ کا بے چارہ ہونا لازم آتا ہے، جس کے بعد کسب اور قدرتِ حادثہ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی خالص جبریت ہے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جبریت کے مقدمات کو تسلیم کر لینے کے بعد کوئی شخص عقیدۂ جبر کی انتہا کو پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا، بیچ میں کسی مقام پر ٹھیر جانا اس کے لئے ممکن نہیں ہے ۔[1]

[1] بالکل یہی حال مسیحی متکلمین کا بھی ہے۔ ان کے ایک بڑے گروہ کے عقائد اس باب میں وہی ہیں جو اشاعرہ کے ہیں۔ سینٹ آگسٹائن (St. Augustine) نے جبریت خالصہ سے بچنے کی بہت کوشش کی ہے، مگر خدا کو فاعلِ حقیقی اور انسان کو محض ایک منفعل ہستی مان لینے کے بعد وہ اپنے مذہب کو خالص جبریت سے نہیں بچا سکا۔ اسکوٹس ایریجنا (Scotus Erigena) جو مدرسیت (Scholasticism) کا بانی اول ہے، خدا کے فاعلِ اعمالِ عباد ہونے میں انتہا درجہ کا غلو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا تمام کائنات کی روح ہے، اور وہ خدا ہی ہے، جو زندگی، قوت، نور، عقل بن کر موجوداتِ عالم میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ سینٹ آنسلم (St. Anselmus) عام مسیحی اعتقاد کے مطابق انسان کے پیدائشی گناہ اور پھر خدا کے مسیح کی شکل میں نزول کرنے اور انسان کے گناہ کا کفارہ بننے کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ اس اعتقاد میں جبر کے سوا کسی اور چیز کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ ابیلارڈ (Abelard) اور سینٹ ٹامس اکون (St. Thomas of Aquin) دونوں ارادۂ الٰہی کو وجوبی و جبری قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک خدا ہی بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے۔ بلکہ موخر الذکر نے تو اشاعرہ کی طرح تکلیف مالا یطاق کے جواز کا عقیدہ بھی اخذ کر لیا ہے۔ ممتاز مدرسین میں صرف ایک ڈونس اسکوٹس (Duns Scotus) ایسا شخص ہے جس نے معتزلہ کی طرح قدریت کا مذہب اختیار کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کو ارادہ کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ کو فعل میں لانے یا نہ لانے کا پورا اختیار حاصل ہے، اور خدا کی قدرت انسان کی آزادیِ اختیار میں مانع نہیں ہے۔

قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال لطف یہ ہے کہ جبریہ بھی اپنے مذہب کے حق میں قرآن مجید ہی سے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اور ایک دو نہیں سینکڑوں آیتیں ایسی پیش کر دیتے ہیں جو قدرت کی مخالفت اور جبریت کی زبردست مؤید ہیں۔ مثلاً۔

وہ آیات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام قوت کا مالک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے دنیا میں اس کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ــ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ــ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ــ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ــ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ــ

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر واقعہ کے متعلق خدا کا فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے، اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی فیصلہ کے مطابق ہوتا ہے۔ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ، وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ــ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ ــ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ ــ مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ــ

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لئے ایک تقدیر مقرر کر دی ہے، رزق، عزت و ذلت، راحت و مصیبت، موت و حیات، سب اسی تقدیر کے مطابق ہیں اس میں کمی و بیشی ممکن نہیں ہے۔ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ــ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ــ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ ــ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ــ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ ــ

لا یستأخرون ساعۃً ولا یستقدمون۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت خدا کی مشیت کے تابع ہے بندے کو کچھ اختیار نہیں سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ انسان اپنی تدبیر سے خدا کے فیصلوں کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتا۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ لیس لک من الامر شیءٌ۔ ولا تقولن لشیءٍ انی فاعلٌ ذٰلک غداً الا ان یشاء اللہ۔ قل ان الامر کلہ للہ۔ قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتال الیٰ مضاجعھم۔ وان یمسسک اللہ بضرٍ فلا کاشف لہ الا ھو وان یمسسک بخیرٍ فھو علیٰ کل شیءٍ قدیرٌ وھو القاھر فوق عبادہٖ۔ فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلاً۔

وہ آیات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ یضل بہٖ کثیراً ویھدی بہٖ کثیراً۔ من یشأ اللہ یضللہ ومن یشأ یجعلہ علیٰ صراطٍ مستقیم۔ فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام۔ اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ومن یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلاً۔ ومن یرد اللہ فتنتہ فلن تملک لہ من اللہ شیئاً۔ اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم۔ ولو اننا نزلنا الیھم الملٰئکۃ وکلمھم الموتیٰ وحشرنا علیھم کل شیءٍ قبلاً ما کانوا لیؤمنوا الا ان یشاء اللہ۔

وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یہ نہ تھی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور اختلاف نہ کریں ورنہ خدا چاہتا تو سب ایمان لے آتے اور دین کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی

رَبّنا - وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ـــ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ
لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ، أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ـــ اس ضمن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ
بہت سے لوگ دوزخ ہی کے لئے پیدا کیے گئے ہیں۔ مثلاً وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۔

وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کافروں اور منافقوں کو ایمان اور حسن عمل سے روک دیا
ہے، اور ایسے لوگ راہ راست پر آ ہی نہیں سکتے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ اوامر و نواہی کے لئے
مکلف قرار دیے گئے ہیں اور سرتابی و سرکشی کے عوض انکو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ـــ فِي قُلُوبِهِمْ
مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ـــ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي
آذَانِهِمْ وَقْرًا ـــ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ ـــ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۔

وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو جن برے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مبتلائے
عذاب کیا جاتا ہے۔ وہ خدا ہی کے حکم اور ارادے کے تحت ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ وَإِذَا أَرَدْنَا
أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ـــ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ
مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ـــ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ـــ وَلَا تُطِعْ
مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۔

وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی نے ان شیطانی ہستیوں کو انسان پر مسلط کیا ہے جو
اس کو بہکاتی رہتی ہیں۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ـ وَقَيَّضْنَا

اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ — وَقَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ

متکلمین کی ناکامی متکلمین اسلام کے ان دونوں گروہوں کی تقریریں دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلۂ جبر و قدر کو حل کرنے میں دونوں کو ناکامی ہوئی ہے مگر اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن سے ہدایت حاصل کرنی چاہی تھی اور قرآن نے انکی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سے استفادہ کرنے کے بجائے فلسفیانہ طریق پر فکر کی اور دو متخالف پہلوؤں میں سے ایک ایک پہلو اختیار کر لیا پھر اپنے اعتقاد کی تائید میں دلائل ڈھونڈھنے کے لئے قرآن مجید پر نگاہ ڈالی جو آیات اپنے موافق مطلب نظر آئیں ان کو لے لیا، اور جو آیات اپنے اعتقاد کے خلاف نظر آئیں ان کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیا۔ دونوں فریقوں کی جانب سے جو آیات پیش کی گئی ہیں ان کو آپ نے دیکھ لیا۔ بعض آیات صریح قدر کا حکم لگاتی ہیں جن سے جبر کا پہلو نکالنا ممکن نہیں ہے اگر جبریہ پھر بھی ان کی تاویل کرتے ہیں، اور ایسے معنی پہناتے ہیں جن کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ یہی حال قدریہ کا ہے۔ وہ جبر کا صریح حکم لگانے والی آیات کو قدر کے مطلب پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس میں ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ آیت کے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کی بحثوں سے صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو پہلے سے ایک اعتقاد قائم کر چکا ہو اور قرآن مجید سے صرف اس کی تائید چاہتا ہو۔ رہا وہ شخص جس نے خود پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کی ہو، اور جس کی خواہش یہ ہو کہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ جبریہ اور قدریہ کی بحثوں کو پڑھ کر ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا، بلکہ کچھ عجب نہیں کہ وہ خود قرآن مجید ہی کی طرف سے بدعقیدہ ہو جائے۔ اس لئے کہ جس طرح دونوں فریقوں نے آیات قرآنی کو لے کر ان سے دو بالکل متخالف عقیدوں پر استدلال کیا ہے، اس کو دیکھ کر ایک ناواقف آدمی اس بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ قرآن مجید کے بیانات میں معاذ اللہ تناقض و تعارض ہے۔ (باقی)

نقد و نظر

موازنۂ ہلال و صلیب از جناب نکہت شاہجہاں پوری بی اے حجم ۲۰۷ صفحات قیمت ۸عہ

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنو۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ تمدن میں علم و تہذیب کی جو خدمت کی تھی، جہالت و غفلت نے اس پر تو بر تو پردے ڈال دئیے ہیں۔ یورپ نے بڑی بلند آہنگی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علم و تہذیب کے احیاء و ارتقاء میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں، اور ہم اس کے علوم و اکتشافات، ایجادات و صنائع، اور سیاسی استیلا سے مرعوب ہوکر اس قولِ مزخرف پر ایمان لے آئے۔ جہلاء اور متفرنجین کا ذکر نہیں۔ وہ لوگ بھی جو علم سے بہرہ ور ہیں کما حقہ آگاہ نہیں کہ انہی کے نامور اسلاف کا علم و تمدن تہذیب حاضر کی اساس ہے۔

جناب نکہت نے اسی حقیقت کو اپنوں کی زبان سے نہیں، کہ اس دورِ مرعوبیت میں اپنوں کی بات قبول کرنے کے لئے لوگ طیار نہیں۔ یورپ کے حق پسند اہل العلم کی زبان سے بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ مغرب زندگی کے مختلف شعبوں میں حاملانِ قرآن کے علم و تمدن کا کس قدر مرہونِ منت ہے، اور یہ کہ علوم و آداب مغرب میں مسلمانوں کے عہدِ اقبال کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ کتاب سترہ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب کے تحت محنت و کاوش سے قابلِ قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ زبان و بیان دلپذیر ہے۔

دعوتِ عمل مرتبہ مولوی عبدالحامد صاحب قادری بدایونی حجم ۵۰ صفحات قیمت ۸ر ملنے کا پتہ عابد القادری مولوی محلہ بدایوں یو پی

قرآن مجید کی تعلیمات اور اس کے احکام کو الگ الگ ابواب کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ ہر آیت کے مقابل اس کا سلیس ترجمہ دے دیا گیا ہے جس کو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ عوام و خواص سب کے لئے کارآمد ہے۔ اور خاص کر بچوں کو پڑھانا۔ اور روزانہ ایک ایک دو دو آیتیں مع ترجمہ کے یاد کرا دینا بہت مفید ہے۔

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـہ ۱۰	صعـہ ۲۵	صللعـہ ۴۵	لـہ ۸۰
نصف صفحہ	لے ۶	صعـہ ۱۵	صعـہ ۲۵	صللعـہ ۴۵
ربع صفحہ	للوٗ ۴	عـہ ۱۰	اوعـہ ۱۷	صعـہ ۲۵

۱۔ کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳۔ صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہیئت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴۔ نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۵۰ فیصدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M 2950

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا
مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔
ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی
ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے لہذا کوئی صاحب عایت
کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے
لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔
لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شایع کرے

منیجر "ترجمان القران"
خیریت آباد (حیدر آباد دکن)

باہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب اعظم سٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا